FREE

دیارِ ادب

شاد قدوائی

www.kitaabistan.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیارِ ادب

سفر نامہ

[redacted] لاہور سے لکھنؤ تک

لکھنؤ سے بھوپال تک

شاد قدوائی

۱۹۵۷ء

قیمت: عہ

www.kitaabistan.com

جملہ حقوق محفوظ

ثقہ اُردو علم و ادب کے شائقین اور ادب برائے حیات کے قائلوں
کے نام

Hashm[redacted]
Govt.
Lower Mall. Lahore.

شادؔ قُدوائی

سنہ ۱۹۵۷ء

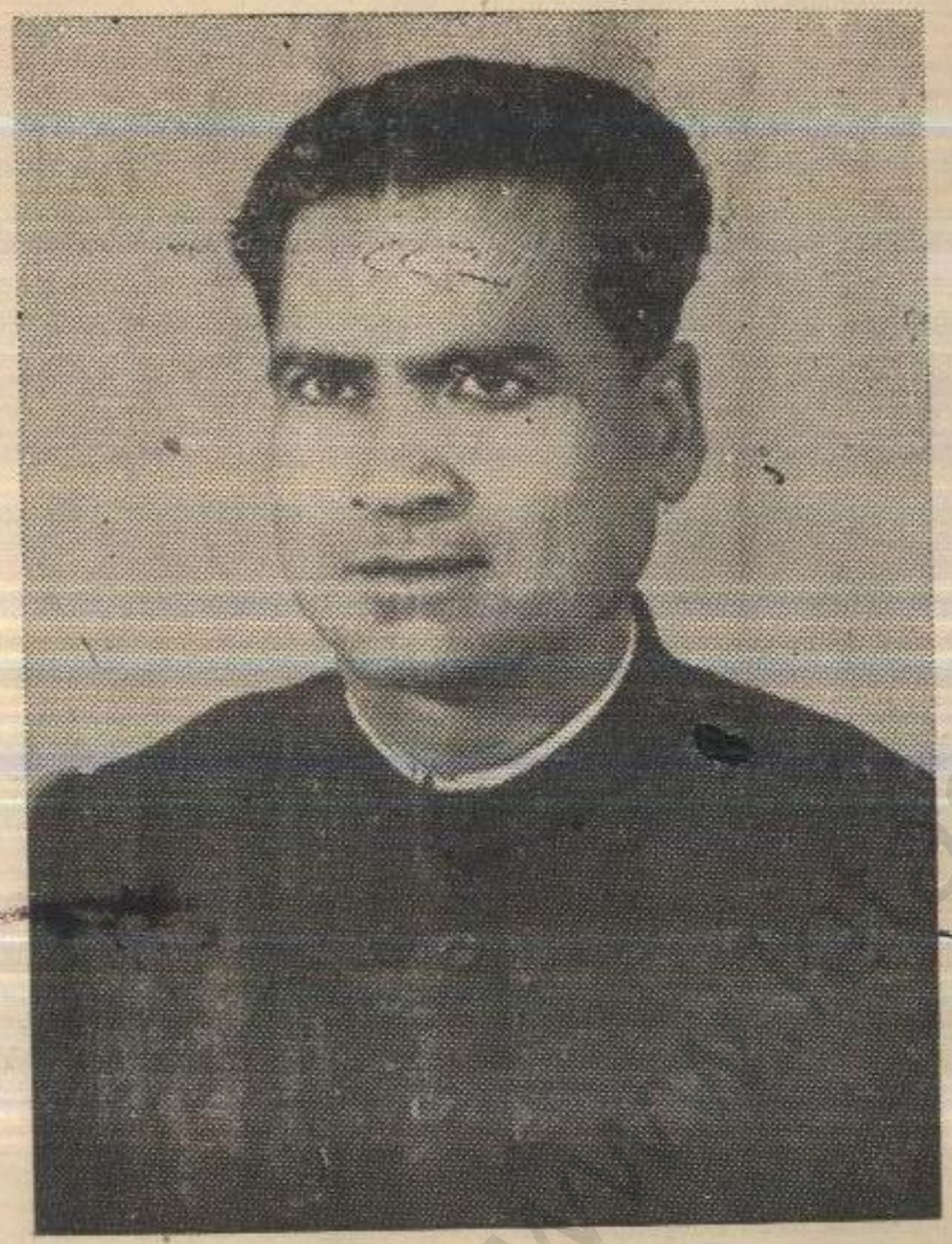

جسے شرمندۂ نام و تخلص شادؔ کہتے ہیں
وہ سرشارِ تمنا خوگرِ رنج و الم بھی ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لاہور سے لکھنؤ تک

اُس کبھی نہ فراموش ہونے والے رُوح پرور سفر کے دلچسپ واقعات پڑھنے سے قبل بطور مقدمہ چند مخصوص حالات پر ایک نظر ڈال لیجئے تاکہ کسی کڑی کے جوڑنے میں زحمت محسوس نہ ہو۔ یہ سفر کیوں کیا گیا اور کن اغراض کے ماتحت۔ بس اتنا ذہن نشین ہونے کے بعد کسی نوع کی بے کیفی کا اندیشہ باقی نہ رہے گا اور ایک رائج الوقت چلے ہوئے مقولہ "حسنِ اتفاق" کا ٹھیک ٹھیک مفہوم سمجھ میں آ جائے گا۔

میں وسط ۱۹۲۶ء میں ریاست کپورتھلہ کے "مسعود انجینئرنگ کالج" میں زیرِ تعلیم تھا۔ شاعر تو نہ تھا البتہ ذوقِ شعر سے وافر حصہ نوازا گیا تھا، اور شاعری سے لگاؤ پورے طور پر کم عمری ہی سے رکھتا تھا۔ حسنِ اتفاق سے ایک آل انڈیا مشاعرے میں شرکت کی غرض سے حضرت مولانا سرشار سنڈیلوی (لکھنوی) سیہور (بھوپال) سے تشریف لائے۔ مشاعرے میں ان کی غزل سُنی، مجھے اُن کا رنگِ کلام، حسنِ ادا اور طرزِ خطاب بہت پسند آیا۔ دیر میں اُن سے تفصیلی ملاقات ہوئی اور دیر میں شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ تین چار دن تک شعر و شاعری کا شہر میں خوب چرچا رہا۔ چھوٹی بڑی کئی نشستیں ہوئیں، مقامی اور بیرونی شعرا کا منتخب کلام سکون اور اطمینان

Scanning Project 2015

Book No.66

Donated By:
Hammad Nasir

Special Courtesy :
Salman Siddqui

Managed By:
Rashid Ashraf
zest70pk@gmail.com
www.wadi-e-urdu.com

www.freeabistan.com

ے سننے میں آیا جس کا ذائقہ آج تک یاد ہے، اس زمانہ میں کیا مشاق کیا متوسط
اور کیا نوآموز سبھی شاعر تحت اللفظ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ یا اپنی پرسوز ربجائے ملکی باشندہ کے اجنبی سمجھا جانے لگا، اب علامہ محوی بھی بوجہ
میں غزلیں پڑھتے اور دوسروں کی سنتے تھے، آج کل کی طرح گا کر، ناچ کر، تھرکرانہ سالی یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر بھوپال آچکے تھے اور
کر اور تانیں لگا کر نہیں پڑھتے تھے، موسیقی اپنی جگہ تھی اور شاعری اپنی جگہ پر، واقعہ میں اقامت پذیر۔ کچھ دن سکون و اطمینان سے گذرے لیکن آمدنی مسدود
ہے کہ تحت اللفظ یا خاص لے میں پڑھنے والے شعر کی تصویر کشی اور مفہوم کی وہو جانے کے باعث نظامِ حیات میں ابتری پیدا ہوگئی اور اسی کے نتیجہ میں
کامیابی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ آج کل کے گلے باز شاعروں کو صرف گلے کے، دو پن کی صحت خراب ہوگئی اور اچانک شدید اور تشویشناک علالت اپنے جلو میں
آواز کی زیروبم اور تال سُر کی دلکشی کی داد ملتی ہے شعر کی عمدگی اور بے پناہی کی لائی۔
نہیں، بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو یونہی زبان پر آگیا، زمانہ کی قدریں بدل چونکہ ۱۹۴۷ء کے خونین انقلاب میں جالندھر سے بچوں سمیت ناگفتہ بہ حالات
گئیں ہوائیں اور فضائیں تبدیل ہوگئیں، روزمرہ کا رہن سہن، آدابِ مجلس، تہذیب دارد پاکستان ہو کر لاہور میں قیام کرنا پڑا تھا لہٰذا ذہن و دماغ میں وہی سراسیمگی اور
وتمدن ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہوگئے پھر شعر و شاعری کی دیرینہ وحشت سمائی ہوئی تھی، جب ذرا سکون ہوا تو میں نے اپنے دونوں بزرگوں (محوی
روایات کیونکر برقرار رہ سکتی تھیں، تقریباً ایک ہفتہ قیام کے بعد حضرت سرشار سرشار) پر زور دینا شروع کیا کہ دونوں حضرات پاکستان چلے آئیں، میں اور میرے
بوجہ ملازمت بھوپال تشریف لے گئے۔ میں بذریعہ ترسیل کلام اُن سے رجوع کے اپنے ہر ممکن خدمت کیلئے ہمیشہ کمربستہ رہیں گے، مگر متواتر اور مسلسل آٹھ سال کی گذارشوں
رہا اور وہ کمال شفقت سے میری معلومات میں تدریجی اضافہ کرتے گئے۔ بعد میں کے بعد ان دونوں بزرگوں نے یہ کہہ کر کہ "جو کچھ خدا دکھائے تجھے شکرا کے دیکھ"
میری ملازمت کا سلسلہ جالندھر میں قائم ہوا، شاید چھ یا سات سال کے بعد سرشار یہاں آنے سے صاف لفظوں میں انکار کر دیا، میرا شوقِ نیاز بڑھتا گیا اور اصرار جاری
صاحب نے اپنی ملازمانہ مصروفیتوں کے باعث مجھے اپنے اُستاد حضرت علامہ رہا، آخر کار دونوں حضرات نے مجھے کچھ دنوں کیلئے بھوپال اور لکھنؤ آنے کی دعوت
محوی صدیقی لکھنوی کے سپرد کیا جو ان دنوں مدراس یونیورسٹی میں اردو کے دی، اور یہی دعوت آتشِ شوق کو تیز کرنے کا سبب بنی، چھ ماہ تک غرقِ تفکر رہا، ایک
لکچرار تھے، اس تبدیلی سے میرے وجدان اور ذوق کو کسی قسم کا نقصان نہیں طرف مجبوریاں تھیں اور دوسری طرف محسنوں کے جذبۂ محبت و اخلاص کی مسکراتی ہوئی
پہنچا اور رفتارِ ترقی اعتدالی شکل میں قائم رہی۔ پرچھائیاں۔ ان بزرگوں کے خطوط میں بلا کی کشش اور قیامت کا زور تھا کہ مجھے ہار
۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند و پاکستان کے سبب مجھے لاہور منتقل ہونا پڑا ماننا پڑی۔ اور میرا دل ان کی طرف بے اختیار کھنچتا چلا گیا۔ اب روزانہ خواب و خیال میں
لکھنؤ اور بھوپال کی سیریں ہونے لگیں اور بے پناہ شفقتوں کا مزہ آنے لگا۔ سوچا اور

بار بار سوچا کہ جن حضرات کی ملاقات کا تصور اتنا خوشگوار ہے تو واقعی اُن کی حضور
کتنی فرحت بخش ہوگی، لکھنؤ والوں کی تہذیب و شائستگی، ان کے مزاجوں کی شگفتگ
مہمان نوازی، اور وسیع الاخلاقی کی داستانیں ذہن و دماغ میں آراستہ تھیں ایک
ایک کرکے یاد آتی گئیں تو صلوں کو بڑھاتی اور دغدغوں کو گھٹاتی رہیں، آخروہ
ساعتِ سعید آگئی جس میں اللہ کا نام لے کر ان دونوں حضرات کو خطوط کے ذرا
مطلع کر دیا کہ بس اب حاضری ہو رہا ہوں، پاسپورٹ قانونی منزلیں طے کر
تو رختِ سفر باندھوں، سب سے اہم سوال زمانہ موجودہ کے قوانین کے ماتحت
زرِ نقد کی محدودیت کا تھا۔ اس پر بھی قابو پالیا، اور قانون کی پوری پابندی اپنی جیب او
منی بیگ پر عائد کر کے ۲۰ فروری ۱۹۵۶ء کو ساڑھے تین بجے سہ پہر جمعرات کے
مبارک دن لاہور ریلوے اسٹیشن کے پاکستانی عملہ کسٹم کی منتظم و مکمل جامع
تلاشی سے فارغ ہو کر لکھنؤ جانے کیلئے ڈاک گاڑی پر سوار ہوا، گاڑی سنسنا
ہانپتی ہوئی میری تازہ غزل گنگناتی ہوئی اٹاری پہنچی، یہاں پاکستانی پولیس
کا حفاظتی دستہ دونوں طرف گاڑی کے دروازوں سے اُتر گیا، اور اسی ترتیب
سے دونوں سمتوں سے ہندوستانی پولیس کا حفاظتی ہیچ سوار ہو گیا، مسافروں
کیلئے پولیس والوں کی موجودگی بڑی اطمینان بخش ہوتی ہے، چوروں کا کھٹکا نہ
اُچکوں کا ڈر، جیب تک جی چاہے جاگئے، جتنا چاہے سو لیجئے، نے غمے دزدے
نے غمے کالا" البتہ ہر درجہ میں دو چار دل کے چور ضرور ملیں گے، جن کی مختصر
تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ "ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے" ان حسین چور
کی نظر آپ کی جیب، آپ کے سوٹ کیس یا ہولڈال کی طرف نہ ہوگی، بلکہ

ناشتہ دان کی طرف، پھلوں کی ٹوکری کی طرف اور تھرماس کی طرف، اگر تنہا خوری
بارِ خاطر ہو تو یہ معمولی سی کوشش کے بعد رفع ہو جائے گی اور آپ خوب شکم سیر
ہو کر کھانا کھا سکیں گے، گنجائش ہو تو کسی احتیاط کی ضرورت نہیں ورنہ ہوشیار
اور چوکس رہنا چاہیئے، یا اگر بیوقوف بننے میں حلاوت محسوس کرتے ہوں تو سب
مشورے بے مزہ ہیں، اس قسم کی چوٹیں بعض اوقات مزیدار بھی ہوتی ہیں اور
تکلیف دینے والی بھی، اس کا انحصار آپ کے ذوقِ سلیم پر ہے۔ ایک گھنٹہ
کی مسافت کے بعد چھنچھناتی، سیٹیاں بجاتی گاڑی امرتسر ریلوے اسٹیشن پر
پہنچ گئی۔ سب مسافر اُتر گئے، اور عملہ کسٹم کے سامنے تلاشی کیلئے سب مسافر
قطاریں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ یہ سماں کتنا افسوسناک اور اہانت آمیز ہوتا
ہے اس کا صحیح اندازہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب آپ خود بھی بہ نفسِ نفیس
اس منظر سے دوچار ہونے کا فخر حاصل کریں، قطار باندھ کر کھڑے ہوں اور
ایک دوسرے کا منہ حسرت سے تکیں، تلاشی کا کام کوئی ایک گھنٹہ تک چلتا
رہا، اس کے بعد تمام مسافروں کے ویزے (راہداری) دیکھے گئے۔ ایک سردار
صاحب جو غالباً ڈپٹی لینڈ کسٹم افسر تھے ایک نوجوان حسین عورت کے ڈیڑھ دو صد
بالوں کو جھک جھک کر اور خوب کس کس کر دبا دبا کے دیکھ رہے تھے کہ مبادا
ان میں سونا بھرا ہو یا اور کوئی ممنوعہ شے، وہ مسافرہ حیرت زدہ کھڑی تھی اور سردار
صاحب کی تگ و دو اور جانفشانیوں کی داد دے رہی تھی، لیکن انہیں کوئی جھول
چھپا نظر نہیں آ رہا تھا۔ آخر سردار صاحب مایوس ہو کر ایک پاس کرنے کا نشان
چاک سے بنا کر چل دیئے، گاڑی کے چلنے میں تھوڑا وقفہ تھا کہ کیلا فروش

ہمارے ڈبے کے سامنے اپنے مخصوص انداز میں صدا لگاتے آنکلا، اکثر لوگ جیسے
منتظر ہی تھے بیٹھے نہیں بلکہ اُس پر ٹوٹ پڑے، اُن کی دیکھا دیکھی میں نے
بھی ایک درجن تیار کیلا خریدا، آن کی آن میں نصف درجن پر ہاتھ صاف کرکے
اطمینان سے بیٹھ گیا، شاید لکھنوی حضرات کو اس پُرخوری پر تعجب ہو رہا ہو لیکن سنا
ہے کہ لکھنؤ والے آم بھی اسی کشادہ دلی سے کھاتے ہیں جس طرح ہم لوگ
کیلا وغیرہ، اتنا فرق ہے کہ کیلا جلد شمار میں آجاتا ہے اور آم شاید گننے کی
نہیں کھانے کی چیز ہوتے ہیں، اور آم بھی کم چیلے رس کے ہوں۔ گاڑی
نے سیٹی دی اور چل پڑی، چلتے چلتے نو بجے کے قریب جالندھر اسٹیشن پر
رکی، میں نے چاروں طرف ایک حسرت زدہ نگاہ ڈالی، آنکھیں ڈبڈبا آئیں،
سکون کا شیرازہ بکھر گیا اور ماحول کی فضا کے ساتھ دل کی حالت بھی کچھ سے کچھ
ہو گئی جبکہ ۱۹۴۷ء سے پہلے میں جالندھر میں گیارہ بارہ سال مقیم رہ کر جالندھر
بدر کر دیا گیا تھا، یکے بعد دیگرے سینکڑوں باتیں یاد آگئیں، جالندھر کے صبح و شام
وہاں کے روز و شب، احباب کے جمگھٹے، اپنے شاعرانہ اور غیر شاعرانہ مشغلے
سیر و تفریح، سکون و اطمینان، گھر اور در سبھی کچھ تو نگاہوں میں پھر گئے، ہمارے
ڈبے میں بہت سے ہندو سکھ صاحبان سوار تھے، میری طرف دیکھ کر تقدیر کا
رونا رونے لگے، دل کو کچھ دیر بعد ڈھارس بندھی، مگر راستہ میں بار بار یہی
خیال آتا رہا کہ ۱۹۴۷ء میں انسانیت نے حیوانیت کا چولا بدل کر اپنی بربریت
دکھائی تھی اور اب رجعت قہقری کرکے انسانیت اپنے کئے پر پشیمان ہو رہی ہے
گاڑی سرپٹ دوڑتی جا رہی تھی نہ جانے کتنے اسٹیشنوں پر اس کی نظرِ التفات

نہ ہوئی۔ صرف بڑے بڑے اسٹیشنوں، لدھیانہ، انبالہ، سہارنپور، مراد آباد، بریلی
شاہجہاں پور سے شرفِ نیاز بخشی، مسافروں کو دانے چارے سے لگائی، پوریاں
کچوریاں، چپاتیاں کھلائی پلائی، دوسرے دن ایک بجے دوپہر کو لکھنؤ کے مشہور
عالم خوشنما اسٹیشن چارباغ پر پہنچ گئی، اپنی روانگی کی اطلاع میں ایک اَن
دیکھے کو پہچاننے کے لئے اپنے لباس کی تفصیلات درج کر دی تھیں یعنی
سرمئی سیاہ رنگ کی شیروانی میں ملبوس، ہاتھ میں سرخ رومال لئے، سر
پر خاکی رنگ کا سولا ہیٹ پہنے تھا، لہٰذا جیسے ہی ڈبے سے اُترا عجب
سے ایک کھلا ہوا آغوش روبرو تھا، آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک،
ہونٹوں پر مسحور کن تبسم، زبان پر نرم و شیریں الفاظ، لباس میں شاعرانہ موزونیت
یہی تھے محترم حضرت سرشار جو مع اپنے تین خوشگو شاگردوں جناب نسیم صدیقی،
کلام صدیقی اور کیف رضوی لکھنوی میرے خیر مقدم کیلئے آئے تھے مصافحہ
اور طویل معانقہ کے بعد اپنے تینوں باوضع، خوش پوشاک اور پیکرِ اخلاق استاد
بھائیوں سے متعارف ہوا، دل کی کلی کھل گئی، جیسے حدِ نظر تک مسکراہٹوں کا
چمن زار لہلہا رہا ہو، اور عطرِ دلنوازی کی بارش ہو رہی ہے، پلیٹ فارم ہی کے ایک
صاف، ستھرے اور اول درجہ کے ریستوران میں جا کر بیٹھے، میں سفر کی
سرگزشت بھی بیان کرتا جاتا تھا اور کیک، انڈے، پیسٹری، چائے وغیرہ سے
بھی نپٹ رہا تھا، اس کے بعد لکھنؤ کی خاص الخاص مورّق گلوریاں کھائیں،
سگریٹ سے تازگی حاصل کی اور اسٹیشن سے باہر آکر ایک اونچے درجہ کا
ٹانگہ لیا، نسیم صدیقی اور کیف رضوی اپنی اپنی سائیکلوں پر دائیں بائیں چلے

بقیہ تانگے پر سوار ہوئے۔ کوئی آدھ گھنٹہ میں مسافت طے ہوئی اور فرودگاہ سرشار پر حیدر گنج قدیم جا پہنچے، سفر کی تھکن کی وجہ سے تھوڑی دیر آرام کرنے کیلئے لیٹ گیا اور بلا ارادہ لیٹتے ہی سو بھی گیا، چار بجے شام کو جب میں غنودگی ہی میں تھا ایک صاحب تشریف لائے مولانا سرشار سے کچھ سمجھ میں نہ آنے والی باتیں اور کچھ سرگوشیاں کر کے جلدی ہی واپس تشریف لے گئے، برادرم معین صبوحی خلف جناب سرشار نے مجھے جگایا اور چائے پینے کو کہا، منہ ہاتھ دھونے کی فکر میں تھا کہ عزیزم شعیب عرف نزارے میاں" اور عزیزہ فریدہ بیگم عرف "اچھی بی" ہمارے کمرے میں اپنی خوشی و مسرت کا مظاہرہ شور و غل سے کرتے ہوئے آئے اور "شاد صاحب" "شاد صاحب" کہہ کر لپٹ گئے، آداب و تسلیمات کے بعد ایک ایک سے نام پوچھا کچھ شرمائے کچھ لجائے بچے تو پھر بچے "آخر نام بتائے اور "چائے پیجیے" "چائے پیجیے" کی رٹ لگانے لگے، میں نے دونوں کو ممکنہ دعائیں دیں، سینے سے لگایا، سروں پر ہاتھ پھیرا اور ہاتھ منہ دھو کر چائے پینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میرے ایک اور استاد بھائی جناب بابو اُما شنکر نازل ایم۔ اے تشریف لے آئے، عمر کوئی پچاس باون کے لگ بھگ، اودھ سکریٹریٹ لکھنؤ میں مترجم ہیں اور ذرا کچھ "سنتا نہیں، ہوں بات مکرر کہے بغیر" کے مرض میں مبتلا" ان سے تعارف ہوا، معانقہ کیا اور ہم سب چائے نوشی میں مصروف ہو گئے۔ میری آمد پر بڑی مسرت کا اظہار کیا اور اس زمانہ میں (جب سردی شباب پر تھی) اتنے طویل سفر کی زحمت گوارا کرنے کی ہمت کو سراہا، ماحول کے داعیے اور ذوق کے تقاضے

بیدار ہو گئے، کچھ شعر و سخن کا تبادلہ ہوا، آپ بھی سن لیجیے جناب نازل کا ایک شعر لطیف طنز میں کس قدر شاندار تھا۔ فرماتے ہیں ؎

زبانیں سبھی دست بستہ کھڑی ہیں ذرا دیکھنا "ناگری" آ رہی ہے!

یا پھر یہ شعر کیا سمجھ سکتے ہیں گھامڑ ہندی و اردو کا فرق ÷ بھنگ کے کلھڑ کہاں صہبا کے پیمانے کہاں

اور یہ کس غضب کا شعر ہے ؎

آیا ہے انقلاب کا بچہ وجود میں ہاتھوں میں خشک دودھ کا ڈبہ لئے ہوئے

جنابِ نازل ایک جلدی شروع ہونے والے مشاعرے کی فکر میں تھے، جنابِ سرشار سے مشورہ کر کے غزل بیگ میں رکھی اور روانہ ہو گئے۔ اب مغرب کا وقت آگیا تھا، وضو کیا اور نماز سے فراغت کے بعد ایک شہ نشین کی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ نسیم، کلام اور کیف تشریف لے آئے۔ اب کیا تھا مزے مزے کی باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، باتوں ہی باتوں میں معائب و محاسنِ شعر پر موشگافیاں ہونے لگیں، ادبی لطیفے، شاعروں کے طور طریقے، نام کے شاعروں کے ہتھکنڈے، پختہ در شاعروں کے چٹکلے بڑے خوشگوار تھے، پان اور حقے کا دور چل رہا تھا، لکھنؤ کے "چوسیرہ" تمباکو کی دھوم سنی تھی کام و دہن پہلی بار لذت اندوز ہو رہے تھے پینے والے تو مست ہو ہی رہے تھے نہ پینے والے بھی اس کی دلپذیر اور شامہ نواز خوشبو سے جھوم اٹھے۔ اس خاص تمباکو کا نام چوسیرہ اس لئے پڑا کہ دوسری عالمگیر جنگ سے قبل یہ ایک روپیہ میں چار سیر ملتا تھا اور بہترین سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان کے ہر حصہ میں اس کے قدردان اور شائق پائے جاتے" تھے لیکن اب اور چیزوں کے ساتھ ساتھ اس کی قیمت میں بھی اضافہ ہو گیا چار آنے سیر کے بجائے ڈیڑھ دو روپیہ سیر میں دستیاب ہوتا ہے۔

اور مبصرین کا قول ہے کہ ویسا عمدہ نہیں ہوتا، اسی ماحول میں حاضرین کی یہ تجویز ہوئی کہ سرشار صاحب کی صدارت میں ایک مختصر مشاعرے کا انعقاد عمل میں آجانا چاہیئے، چنانچہ سب نے تائید کی، سُنا اور سُنایا، راہ کی تھکن کافور اور اجنبیت دُور ہوگئی۔ اسی کیف وسرور کے عالم میں آدھی رات آگئی۔ پولیس کے حفاظتی دستے سڑکوں اور گلیوں کا گشت کرنے لگے، رات کے سناٹے میں ان کی سیٹیوں کی آوازیں کتنی سہانی ہوتی ہیں اس کا اندازہ تو آپ کو بھی ہوگا۔ ہمارے تینوں "استاد بھائی" مختصر مگر جاندار کہنے کے عادی ہیں، مجھے یہ خصوصیت پسند آئی قافیہ پیمائی مشق سخن کو بڑھانے کیلئے پہلے ہی مفید ہو لیکن مکمل اور مرصع شعر کیلئے کچھ زیادہ سودمند نہیں ہوتی صبح ہوئی ناشتہ کے تھوڑی دیر بعد ہی کھانا کھایا، سرشار صاحب اپنے دفتر جانے کیلئے تیار ہو گئے اور روزنامہ "حق" لکھنؤ کے تازہ ترین پرچے مجھے دیئے گئے۔ دیکھا تو صفحۂ اول پر میرے لکھنؤ آنے کی اطلاع ڈبی ہوئی تھی، انہی کے ساتھ بالاخانہ سے صحنِ مکان میں آیا، التماس کی کہ اپنی اُستانی نازک صاحبہ کی خدمت میں سلام اور نذرانہ پیش کرنا چاہتا ہوں، ارشاد ہوا کہ ضرور اور بے جھجک، یہاں یہ بیان کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ نازک صاحبہ کسی زمانے میں خوب لکھا کرتی تھیں اور ان کا کلام ملک کے اکثر مؤقر رسائل میں شائع ہوا کرتا تھا، مگر کچھ عرصہ سے لکھنا چھوڑ رکھا ہے اب جناب سرشار اُن سے محاوروں کی صحت کی خدمت لیا کرتے ہیں، اور ان کا مشورہ ان کی نظر میں سند کی حیثیت رکھتا ہے، ہاں تو وہ ایک بند کمرے میں بیٹھی کسی کام میں مصروف تھیں، یا صرف اس کی منتظر کہ میں باہر چلا جاؤں تو کمرے کے دروازے کھول کر پردے کی قید سے آزاد ہو جائیں، سرشار صاحب کی

زندہ دلی اس تکلیف کی متحمل نہ ہو سکی مجھے حکم ہوا کہ کیواڑ کا پٹ کھول کر اندر گھس جاؤ اور سلام وکلام کر لو، میں نے دروازے کے پٹ کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے سلام گزارا تھا، انہوں نے دعاؤں کے ساتھ بچوں کی خیریت پوچھی، بیگم شاد کو دیکھے بغیر آج تک بہت تعریف کرتی رہی تھیں، لیکن چونکہ وہ پردے کی بہت پابند ہیں اس لئے میری کوشش ناکام رہی، سرشار صاحب مجھے برابر پُرچک دیتے اور ہنستے رہے، میں نے اپنا یہ شعر پڑھ کر معاملہ کو ختم کردیا ؎

اچھا ہے دل کا اور بڑھے اشتیاقِ دید
میں کیوں مخل ہوں اُن کے شعورِ حجاب میں

آخر کار جناب سرشار کی معیت میں مکان سے باہر آیا، کچھ دُور چل کر نخاس بازار سے ٹانگہ لیا اور سرشار صاحب کے دفتر واقع گولہ گنج میں پہنچا، روزنامہ "حق" کے مالک مینجنگ ڈائرکٹر حاجی عبدالرؤف عباسی صاحب سے تعارف ہوا، فرمایا کہ آپ کے یہاں آنے کی ہمت بہت قابلِ داد ہے، آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، ڈیں تازہ اخبار میں یہ خبر پڑھ کر افسوس ہوا کہ حضرت مرزا یاس یگانہ "وفات پاگئے۔ وہاں سے چار بجے شام کو میں اور سرشار صاحب لکھنؤ کے خوبصورت اور مرکزی بازار امین آباد کی سیر کیلئے چلے گئے، وہاں ٹارچ کی مرمت کرائی جو گذشتہ شب اتفاقاً میرے ہاتھ سے گر کر خراب ہو گئی تھی پھر ایک ہوٹل میں جاکر چائے پی، اور واپسی میں ایک ضروری کام کے سلسلہ میں جناب ہازل صاحب کے دولت خانہ پر واقع رکاب گنج پہنچ گئے۔

بازل صاحب نے بڑے تپاک اور کھلے دل سے ہمارا استقبال کیا۔ لکھنؤی تہذیب کا مظاہرہ ہر انداز سے ہو رہا تھا، مہمانِ عزیز کی آؤ بھگت تل کے لڈوؤں، تلے مٹر، کئی قسم کے بسکٹوں اور خوش ذائقہ چائے سے کی گئی، کام کی نوعیت عرض کی، اس کی اہمیت بتائی، جس کے لئے آنے والی صبح مقرر ہوئی، وہاں سے رکشا پر بیٹھ کر نخاس بازار سے ہوتے ہوئے محلہ پاٹا نالہ میں پیکرِ خلوص جناب نسیم صدیقی کے درِ دولت پر جا پہنچے، یہاں آکر معلوم ہوا کہ مجھ "مہمانِ عزیز" کی دعوت آج شام یہاں ہے، ایک آراستہ کمرے میں فانوس روشن تھے، سفید چاندنیاں گاؤ تکیہ، اُگالدان، گلدان اور خاصدان سبھی کچھ فراہم تھا، دیکھا تو کلام صدیقی اور کیف رضوی پہلے ہی سے ڈٹے ہوئے ہیں۔ معمولی اور رسمی گفتگو کے بعد نسیم صاحب کے چھوٹے بھائی نے دسترخوان بچھایا، پر تکلف کھانا چنا، سب نے خوب مزے لے کر کھایا، اس سے فراغت ہوئی تو پان اور سگریٹ سے شوق کیا گیا، دو چار خوش ذوق اصحاب کا اجتماع بھی کسی بڑی محفل سے کم نہیں ہوتا، معاً یہاں بھی وہی ماحول بن جاتا ہے، غزل سرائی کی تحریک ہوئی، کہنا چاہیئے کہ مشاعرہ شروع ہو گیا، سب نے ایک ایک دو دو غزلیں سنجیدگی مگر وارفتگی کے ساتھ سنائیں، میری باری آئی، اصرار بڑھا، انکار کا محل نہ تھا مگر پیشروؤں کی رسم کو زندہ اور تازہ رکھنے کیلئے معذرت چاہی کہ پھر کبھی دیکھا جائے گا، کھانا بہت کھا گیا ہوں اور گھوما پھرا زیادہ، مگر ظاہر ہے کہ یہ سب عذرِ لنگ ہی کے درجہ میں تھا، دو زانوں ہو کر بیٹھ

www.kitaabistan.com

گیا، جیب سے بیاض نکالی اور ایک دو تین چار غزلیں سُنا ڈالیں، داد اور پھر لکھنؤ والوں کی داد، کلیجہ ہاتھ بھر کا ہو گیا بھاڑ کھل گیا، بے تقاضا مزید سُنانے کو جی چاہنے لگا، میرے بعد ایک غزل سرشار صاحب نے اپنے خاص انداز میں پڑھی، پیرانہ سالی میں بھی جوانوں کا سا لب و لہجہ، جذبات میں زندگی کی لہریں، کوئی ۱۱ بجے یہ چھوٹی سی نشست ختم ہوئی اور مکان پر آکر سو گئے۔

دوسرے دن صبح پروگرام کے مطابق سرشار صاحب کے ساتھ بازل صاحب کے دولت کدہ پر پہنچا، وہ منتظر ہی ملے، سرشار صاحب جلد ہی وہاں سے اپنے دفتر تشریف لے گئے، تھوڑی دیر بعد میں اور بازل جناب ایک رکشا پر سوار ہو کر لکھنؤ کے مختلف فراخ و خوشنما اور پُر رونق بازاروں سے ہو کر سکریٹریٹ کی شاندار عمارت میں پہنچے، وہاں کچھ دیر سستا کر بازل صاحب کے ہمراہ دوسرے دو دفتروں میں جا کر وہ کام سرانجام دیا اور وہاں سے سرشار صاحب کے دفتر میں پہنچ کر کام کی نوعیت اُن سے عرض کی اور دفتر کا بقیہ وقت وہیں گزارا، چار بجے کے قریب نسیم اور کلام آگئے، ہم سب گھومتے پھرتے ایک ہوٹل جا پہنچے وہاں چائے پی، اُس کے بعد حضرت مخدوم شاہ مینا علیہ الرحمۃ کے مزار پُر انوار پر حاضری دی اور فاتحہ خوانی کی سعادت حصہ میں آئی، اللہ اللہ کیا سماں تھا، معلوم ہوتا تھا کہ حدِ نظر تک انوار کا نزول ہو رہا ہے، سنگِ مرمر کی ایک لوح پر یہ شعر بر زیارت کرنے والے کی آگاہی کیلئے کندہ ہے ؎

ھ

جہاں پر احتمالِ گمرہی نے حوصلہ توڑا

وہیں دیکھا ترے نقشِ قدم کو درمیاں ہم نے

قاد قدوائی — علامہ مضطر لکھنوی

ہر کہ خواہد چشمِ دل بینا کند
سرمۂ خاکِ درِ مینا کند

اس کے بعد درگاہ شریف کے سجادہ نشین جناب شیخ شاہد علی مینائی کی خدمت میں ہم سب نے چند لمحے گذارے انہوں نے بہ کمال نوازش چائے، پان، سگریٹ وغیرہ سے باصرار تواضع فرمائی، اور اپنی شستہ و سنجیدہ گفتگو سے دلوں کو مسرور کرنے کی کوشش کی، شام کو کلام صاحب کے یہاں دعوت اور مشاعرہ تھا، لہذا بعد مغرب ہی درگاہ شریف سے روانہ ہو گئے۔ اس مشاعرے میں لکھنؤ کے مشاہیر شعراء کی اچھی خاصی تعداد تھی، غالباً ۲۵ بزرگ تھے۔ اور سب کے چہروں سے فن کی پختگی، کلام کی بلندی اور وسیع معلومات کی روشنی جھلک رہی تھی، ان میں برادرانِ وطن بھی تھے، بارعب و باوقار، اردو شاعری کے علمبردار، علوم کے ماہر، زبان کے بادشاہ فنِ شعر سے خوب آگاہ، دعوت ہوئی تو مشاعرے کا دور شروع ہوا، عجیب سماں تھا، فضا میں یا تو نغمے ہی نغمے تھے یا شعر ہی شعر، جب میری باری آئی تو میں نے بھی ایک تازہ غزل سنائی، بڑی توجہ سے سنی گئی، ہر شخص مسافر نوازی پر تُلا ہوا، ہر شخص حسنِ اخلاق کے رنگ میں رنگا ہوا، حوصلہ افزائی کا ڈھنگ نرالا، طریقِ داد متین و سنجیدہ، پر شکوہ الفاظ کا تسلسل غرض کسی پہلو سے کوئی اعتراض کا شوشہ نہ مل سکا، ڈر رہا تھا کہ مسافر ہوں، اجنبی ہوں، اہلِ زبان کے مجمع میں نامانوس فغاں کی کیا قدر ہوگی، غزل پڑھ

BUREAU OF ... LIBRARY

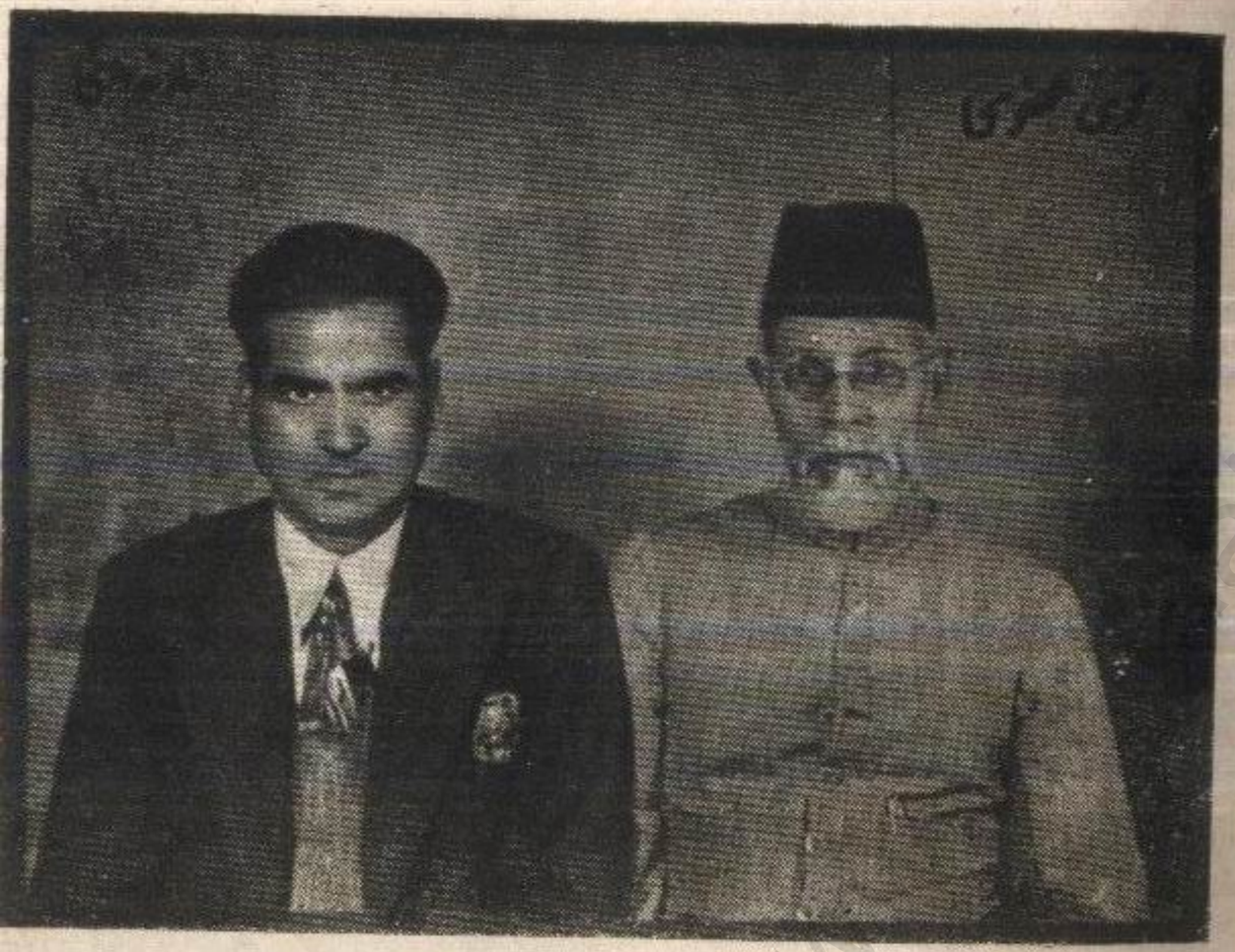

چکا تو بطور خاص کچھ اور سُنانے کیلئے کہا گیا، میں نے حضرت شوق قدوائی لکھنوی علیہ الرحمۃ کی ایک غزل پر خمسہ عرض کیا، یہ بھی پسند فرما کر بندہ نوازی کا ثبوت دیا گیا۔ پھر ارشاد ہوا کہ ایک غزل اور، تعمیلِ ارشاد میں رات کے ڈیڑھ بجے کے قریب ایک غزل پھر سُنائی، بہت داد عطا ہوئی، اس سے یہ اندازہ ہوا کہ لکھنؤ کے مشاعروں میں غزل کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے اور اسی صنف کو اہمیت دی جاتی ہے، اور غزل کا مقام انتہائی بلندیوں اور جدید قدروں سے منجھا ہوا پایا۔ آخر میں جناب سرشار نے اپنا کلام بلاغت نظام سُنایا۔ اُن کے اس شعر پر کرشن بہاری نور لکھنوی تڑپ گئے، اُن پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی، ایسی مسحور کُن کیفیت جس نے پوری محفل کو اپنے اثر میں لپیٹ لیا سب کے دل و دماغ پر چھا گئی، اور بار بار سامعین اور شعرائے کرام نے یہ شعر پڑھوایا ؎

آپ نظمِ جہاں میں سرگرداں
ہم یہاں انتظار کرتے ہیں

دوسرے دن لکھنؤ کے مشہور و مقبول روزناموں "حق" اور "قومی آواز" میں اس مشاعرے کی مکمل روداد نہایت آب و تاب اور تفصیلات کو لئے ہوئے آئی، جس میں مجھ ہیچمدان کی توقع سے کہیں زیادہ قدر و منزلت فرمائی گئی تھی اور رپورٹر نے حاضرین مشاعرہ کے خیالات کی ترجمانی بڑی فراخ حوصلگی سے کی تھی، جس کا تہِ دل سے ممنون

ہوں۔

تیسرے دن تمام وقت مطالعہ میں گذرا، سرشارؔ صاحب کا کتب خانہ کتابوں کی تعداد کے اعتبار سے تو کچھ ایسا بڑا نہیں کہا جا سکتا البتہ جو تھوڑی بہت کتابیں وہ جمع کر سکے ہیں وہ سب نہایت اچھے لکھنے والوں کی ہیں اور جن کا مطالعہ ایک طالب علم علم و ادب کے لئے ازبس مفید ہے، جدید و قدیم رسائل کے مکمل فائل خاص طور پر قابل ذکر ہیں، بڑی دلچسپی سے یہ دن گذرا، شام کے آٹھ بجے جناب عبد القدوس صاحب خنداںؔ کے ہاں دعوتِ طعام کے ساتھ دعوتِ کلام میں شرکت کا پروگرام تھا، یہ مجلسِ مشاعرہ بھی کہنا چاہیئے کہ میرے اعزاز میں تھی، یہاں بھی مختلف اور منتخب شعرائے کرام کا کلام سننے میں آیا میں نے بھی حتی المقدور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، مہمان عزیز کی حوصلہ افزائی اور قدر دانی میں کوئی کمی نہیں کی گئی، حضرات لکھنؤ کے مخصوص الفاظ جو دادِ سخن کے سلسلہ میں میں نے اور کہیں نہیں سنے اتنے پیارے دلآویز، برجستہ اور شائستہ لب و لہجہ میں زیبِ سماعت ہوئے کہ ان کی لطافت کبھی زائل نہ ہو سکے گی۔ شب کے کوئی ایک بجے مشاعرہ ختم ہوا، یہاں بھی جناب سرشارؔ کے ایک شعر نے محفل کو تڑپا دیا، اندازِ بیان کی بے پناہی، پھر ان کے پڑھنے کا مؤثر طریقہ، دیر تک یہی شعر چلتا رہا ؎

چپ کھڑا ہوں ہجومِ محشر میں
منتظر ہوں کہ کوئی پہچانے

سب لوگ جھومتے ہوئے اٹھے اور اپنی اپنی آرام گاہوں کو روانہ ہو گئے۔

چوتھے روز سرشارؔ صاحب کے پڑوس میں آغا علی صاحب افنؔ کے درِ دولت پر ایک اعزازی مشاعرہ شام کے آٹھ بجے منعقد ہوا۔ یہاں کچھ نئے شعراء کا کلام سننے میں آیا، ان کے ماسوا اس مشاعرہ میں بابو اما شنکر ایم۔ اے۔ ہاذلؔ لکھنوی اور مسٹر باقر حسین رنگینؔ کا مزاحیہ کلام سنکر دنگ رہ گیا، مزاح آسان نہیں لیکن وہ بھی یہاں شباب پر نظر آیا یہ دونوں حضرات یہاں کے بہترین مزاح نگار سمجھے جاتے ہیں، مضمون آفرینی کے ساتھ اتنے پتے کی بات نظم کر دیتے ہیں کہ سننے والے بے تاب ہو جاتے ہیں۔

پانچویں دن ادھر اُدھر کی سیر کرتے ہوئے استادی حضرت علامہ محوی صدیقی لکھنوی کے عزیزوں میں سے مولانا محبوب علی صاحب ناظم دائرہ ادبیہ لکھنؤ سے ملاقات ہوئی، آپ عالم و فاضل ہونے کے باوجود نہایت سادہ مزاج اور سادہ وضع کے مالک ہیں، اُن کی شخصیت میں مجھے ایک مخصوص کشش نظر آئی، حسنِ اخلاق، طرزِ تپاک اور دل نشیں اندازِ گفتگو میں ایک با عظمت بلندی لئے ہوئے، ناقابلِ فراموش اور ناقابلِ مقابلہ۔ اپنی نشست گاہ پر لے گئے، چائے، پان، سگریٹ سے نوازا اور کچھ سنانے کا حکم دیا۔ میں نے تعمیلِ ارشاد میں دو تین چھوٹی چھوٹی غزلیں سنائیں، بہت مسرور ہوئے، میری درخواست

بھی رَد نہیں کی گئی اور نتیجہ میں اپنا کچھ کلام سیدھے سادے طریقہ پر پڑھ کر سُنایا، علمیت اور قابلیت کا مظاہرہ لفظ لفظ سے ہو رہا تھا، ہر وقت علمی، ادبی اور فنی نادر کتب کے مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں، موجودہ دوسری بیوی کے ہم مذاق نہ ہونے کے سبب گلہ گذار رہتے ہیں، مولانا کی زندگی اس پہلو سے واقعی بڑی افسوسناک ہے۔

چھٹے دن مولانا معینؔ صدیقی عثمان پوری سے جناب سرشارؔ کی معرفت ملاقات ہوئی، آپ ایک اچھے ہومیوپیتھ ڈاکٹر ہونے کے علاوہ صاحبِ دیوان بھی ہیں اور شعر کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ معمر ہونے کے باوجود بیویوں کے شائق ہیں۔ موجودہ بیوی غالباً چھٹی ہیں جو بیچاری بعض معذوریوں کے باعث نہ صاحبِ اولاد بن سکتی ہیں نہ چل پھر سکتی ہیں، ویسے نہایت خوش سلیقہ، حرف شناس اور حسنِ صورت کی مالک ہیں۔ معینؔ صاحب اس کی والہانہ محبت اور وفاداری کے گیت گاتے رہے جو بلاشک صحیح اور سچے تھے، تبادلۂ کلام ہوا، خوب کہتے ہیں اور دل لگاکر سُنتے ہیں، کسی زمانہ میں احسنؔ سمبھلی (مرحوم) کے شاگردوں میں تھے۔ لیکن اب تقریباً ۳۰-۳۵ سال سے علامہ نحوی سے مشورہ سخن کرتے ہیں۔

ساتویں دن شب کے ۸ بجے ڈاکٹر باقر حسین رنگینؔ کے ہاں مجھ مہمانِ عزیز کے اعزاز میں دعوت اور مجلسِ مشاعرہ برپا ہونے کا دعوت نامہ آیا، یہاں دعوت کسی قسم کی بھی ہو اس کا رَد کردینا

لکھنؤی تہذیب و اخلاق کے خلاف ایک عظیم الشان گناہ ہے۔ لیکن جب میں نے رسمی طریقہ پر اُن کی بہ کارِ سرکار مصروفیت اور بیک وقت اپنی برادری میں دو ایک شادیوں اور دیگر تقریبوں میں شرکتِ لازمی کے پیشِ نظر انکار کیا تو وہ بصد خلوص بہت زیادہ مصر ہوئے، اور معاً مجھے اپنی دل شکستگی اور لکھنؤی تہذیب کی روایات یاد دلاکر زیر کرلیا اور حضرتِ سرشارؔ نے دعوتِ طعام اور محفلِ مشاعرہ میں شرکت کرنے کی رضامندی "ظاہر کردی"، میں مجبوراً خاموش ہوگیا، میں احباب و مخلصین کے جذبات کا ہمیشہ سے قدر دان ہوں لیکن چونکہ کئی روز سے مسلسل جاگ رہا تھا اس لئے ابتدا میں ذرا ہچکچاسا گیا تھا۔

شام کی سیر کے بعد ہم لوگ میاں رنگینؔ صاحب کے دولت خانہ پر پہنچے، پہلے پُرتکلف کھانوں سے کام و دہن کو محظوظ کیا، زعفران اور کیوڑے کی خوشبوؤں سے سرشار محفلِ مشاعرہ میں جا ڈٹے، سرشارؔ صاحب ہی کی صدارت میں حسبِ معمول ایک مختصر خطبۂ صدارت کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا، ایک سے ایک خوشگو خوش لحن اور بلند پرواز شعراء کا کلام یکے بعد دیگرے سننے میں آیا، آج مجھے صدر منتخب کی ایک خاص مہارت کا شدت کے ساتھ احساس ہوا، یعنی یہ کہ انہیں رنگِ محفل کو قائم رکھنے کا بڑا سلیقہ ہے اور چونکہ وہ لکھنؤ کے کم و بیش تمام چھوٹے بڑے شعراء سے بخوبی

واقف ہیں اس لئے اُن کی مرتب کی ہوئی فہرست شعراء کبھی ناکام نہیں رہتی اور لطف بالائے لطف یہ ہے کہ کسی کو اُن سے مقدم و مؤخر کی کوئی شکایت نہیں ہوتی اور مشاعرے کا رنگ بتدریج کیف پرور ہوتا جاتا ہے اور سماں بندھتا چلا جاتا ہے، اسی مدہوش کن ماحول و فضا میں اُن کا نمبر آجاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محفلِ مشاعرہ بامِ فلک سے ٹکرا رہی ہے، آج بھی یہی ہوا، ۹ بجے سے ایک بجے رات تک کا وقت کچھ کم نہیں ہوتا، نہ کسی نے بے کیفی محسوس کی نہ تعجیل سے کام لینے کی کوشش، آخری غزل سرشار صاحب نے شروع کی اور جب وہ اس شعر پر پہنچے ؎

کون رُک سکتا ہے دل کی روشنی کے سامنے
ہم جہاں ملتے ہیں پھر کوئی وہاں ملتا نہیں

تو سامعین کی صفوں میں قیامت برپا ہوگئی، دادِ تحسین سے محفل گونج اُٹھی، غزل کے خاتمہ پر محفل بہت متاثر ہوئی، چند لمحوں کے بعد ایک غزل اور سُنانے کی فرمائش ہوئی۔ چنانچہ جناب سرشار ایک عجیب کیفیت اور سوز میں اس شعر پر پہنچے ؎

سادے سادے آنسوؤں میں جذب کی قوت تھی کم
ہلکا ہلکا خونِ دل کرنا پڑا شامل مجھے

تو سامعین اور شعرائے کرام کی محویت اور تاثرات قابلِ دید تھے سب حضرات ایک عجیب کیفیت لئے ہوئے رات کے ڈیڑھ بجے

اپنے اپنے گھروں کو لوٹے۔

آٹھویں روز میں حسب معمول صبح کے ناشتہ کے بعد جناب سرشار کے قیمتی کتب خانہ کی مختلف علمی و فنی کتابوں کے مطالعہ میں محو تھا کہ برادرم کلام صدیقی صاحب تشریف لائے، اور ذکر ہوا کہ یہاں امام باڑے اور دوسری تاریخی عمارتیں قابلِ دید ہیں، مجھے اشتیاق پہلے ہی سے تھا پروگرام بنا اور تھوڑے سے مباحثہ کے بعد طے ہوگیا، حسبِ قرارداد دوپہر کا کھانا کھا کر ہم دونوں سرشار صاحب کے دفتر میں رکشا لے کر پہنچ گئے چائے پان سے یہاں بھی مدارت کی گئی۔ وہاں سے تین بجے سرشار صاحب کے ہمراہ خراماں خراماں سیر و تفریح کرتے ہوئے امام باڑوں میں پہنچ گئے۔ شاہانِ اودھ کی بنائی ہوئی یہ تمام عالیشان عمارتیں دیکھیں، ان کی کشش دُور دراز کے سیّاحوں کو دعوتِ نگاہ دیتی رہتی ہے۔ میں نے خواہش کی کہ یہاں کی مشہور عمارت "بھول بھلیاں" کی بھی سیر کیجائے، ارشاد ہوا ضرور وہ وہیں ٹھہر گئے اور میں راہ نما کو لے کر اوپر بھول بھلیاں دیکھنے چلا گیا، ہر مقام، ہر تنگنائے، ہر دروازہ اور ہر کھڑکی کے چبوترے پر جاکر ارد گرد کا نظارہ دیکھا۔ تینوں کمروں کے گنبدوں کی محرابیں عجیب و غریب سنہرے کام اور بیل بوٹوں سے بنائی گئی ہیں۔ آخر واپسی

پر میرے راہ نما نے چھپ کر مجھے بھلایا۔ اور کسی دوسرے بازو سے نکل کر مجھے سلام کیا اور بھول بھلیاں کی تصویر میرے سامنے آ گئی۔ نیچے آئے تو جناب کلام اور سرشار صاحب نے ایک مزے کا لطیفہ سنایا۔ کہ ہم چند منٹ کیلئے ایک چبوترے پر خاموش بیٹھے تھے کہ ایک عروسِ نو (دلہن) مع دیگر دو معمر عورتوں کے گھونگٹ نکالے ہماری طرف اس دھوکے میں بڑھی کہ ہم دونوں بھی کوئی نمائشی بت ہیں جو زائرین کی تفریح طبع کیلئے نصب کر دیئے گئے ہیں وہ جب ہمارے پاس آئی تو گھونگٹ سرکا کر حیرت و تعجب سے اپنا منہ ہمارے منہ سے ملا کر دیکھنے لگی۔ یہ بڑا نازک وقت تھا، دو تمتائے ہوئے عارض ایک شاعر کے لرزتے ہوئے ہونٹوں کی زد میں تھے، جناب سرشار نے اپنے چہرے کو دلہن کے چہرے سے دور کرنے کی کوشش میں سر کو جنبش دی تو دلہن کچھ جھینپ اور سہم کر پیچھے ہٹ گئی اور اب اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ کسی مادی دنیا کے معمار کی صورت گری کا نمونہ نہیں بلکہ صانعِ حقیقی کے شاہکار جیتے جاگتے انسان ہیں۔ اسی لطیفہ پر میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا کہ مولانا آپ نے انگڑائی بھی ضرور لی ہوگی۔ میرے اس فقرہ پر دونوں ہمراہیوں نے بھی جوابی قہقہہ

عنایت کیا، وہاں سے چل کر باہر پھاٹک پر آکر ان عالیشان شاہی عمارتوں اور مسجد کی چند تصویریں خریدیں۔ اور "دریائے گومتی" کی طرف بڑھ گئے۔ ایک شاندار پل پر پہنچ کر گومتی کے بل کھاتے ہوئے کناروں کا نظارہ کچھ ایسا جاذبِ نظر تھا کہ کشتی میں بیٹھ کر دریا کے سیر کی اُمنگ پیدا ہوئی، مگر شام ہو رہی تھی، سردی کا موسم اس لئے اس ارادے کو ترک کرنا پڑا۔ یہاں سے جانبِ شرقی نہایت پرفضا مقام پر ندوۃ العلماء کی شاندار عمارت کے گنبد دکھائی دیئے۔ اُسے بھی ذرا قریب سے دیکھنے کی آرزو ہوئی مگر معلوم ہوا کہ یہاں سے کافی فاصلہ پر واقع ہے اور یہ کہ اس وقت شاید سیر کی اجازت کا ملنا بھی دشوار ہو اس لئے اسے بھی نظر انداز کرنا پڑا۔

نویں دن طبیعت کسی قدر بے مزہ تھی، جاگنے اور برابر سیر سپاٹے سے نیز معمولی تھکن محسوس کی اس لئے یہ فیصلہ کیا کہ آج گھومنے پھرنے کے بجائے مطالعہ میں مصروف رہ کر دن گزاروں گا۔ چنانچہ اسی پر عمل کیا، ایک بجے کے قریب چچی جان نے نیچے سے کھانا بھیجا، محمد شعیب سلمہٗ عرف ہزارے میاں بھی آن دھمکے اور ساتھ کھانے لگے۔ کھانے کے دوران عجیب توتلی اور پیاری زبان سے باتیں کرنے لگے۔ حالانکہ تاکید یہ تھی

کہ کھانا کھا چکے ہیں انہیں کھانے میں شریک نہ کیا جائے، لیکن چونکہ وہ مجھ سے بے تکلف معمولی طور پر مانوس اور بے تکلف ہو چکے تھے اس لئے اُن کی دل شکنی کرنے کو جی نہ چاہتا تھا، کھانے کے بعد لکھنے پڑھنے کی میز پر رکھے ہوئے سفید تیل کے لڈوؤں پر ہاتھ صاف کرنے لگے، یہ سرشار صاحب کے چار سالہ پوتے ہیں اور ماشا اللہ بڑے باتونی اور حاضر جواب ہیں، شعر پڑھئے تو سبحان اللہ اور ماشاء اللہ بھی اپنے خاص انداز میں کہہ دیں گے اور اوّل سے آخر تک مشاعروں میں ڈٹے رہیں گے، کبھی کبھی شعر سُنکر بے تحاشہ ہنس بھی دیں گے ایسا وہ کیوں کرتے ہیں اس کا جواب مشکل ہے، کھانے سے فارغ ہو کے میں نے حقہ کے چند کش لگائے، پان کھایا، ہزارے میاں کو ذرا حکمت سے ٹالا، اُنہیں نیچے بھیجا اور مطالعہ کرتے کرتے سو گیا، حسبِ پروگرام چار بجے شام کو میں اور معین بھائی ریکشا لے کر برائے سیر و تفریح اور کچھ سودا سلف خریدنے امین آباد پارک چلے گئے، چند ضرورت کی اشیاء خریدنے کے بعد ایک ہوٹل سے چائے پی کر واپسی کا ارادہ کیا، شام ہو چلی تھی، معین بھائی ایک سینما کے پاس آکر رُکے، مرزا غالب کی تصویر لگی ہوئی تھی، اگرچہ میں سینما بینی کا زیادہ شوقین نہیں مگر معین بھائی کے اصرار پر ٹکٹ خریدے گئے اور سینما ہال میں جا بیٹھے، چونکہ خدائے سخن حضرت غالب

کی تصویر تھی اس لئے پوری توجہ مرکوز کرنا پڑی، لیکن آخر میں بڑی مایوسی ہوئی اور بڑا غصّہ بھی آیا کہ چند بازاری لوگوں نے پیسے کمانے کے کیا بُرے ڈھنگ اختیار کئے۔ اس تصویر کے کسی گوشہ سے مرزا صاحب کی زندگی یا اُن کی بے پناہ شاعری، یا شخصیت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی تھی بلکہ اُن کی صاف و صریح توہین و اہانت کی گئی تھی، ٹائم پورا کر کے واپس مکان پہنچے تو جناب سرشار کا یہ فقرہ کہ آپ غالب کو دفن کر آئے "کبھی نہ بھولیگا" اسی ذیل میں دلچسپ گفتگو کا آغاز ہو گیا، جس کا سلسلہ دیر تک قائم رہا، سینما دیکھنے والوں کے متعلق سرشار صاحب کا کیا نقطۂ نظر ہے وہ ذیل میں پڑھ لیجئے۔

تری دیوانگی حد سے بڑھی جاتی ہے دیوانے
سنبھل او فلم کی پریوں کا جلوہ دیکھنے والے
نئے چہروں کی لو میں اپنی صحت کیوں گنواتا ہے
یہ دولت بے مُنکے گانوں کی دُھن میں کیوں گنواتا ہے
بصارت سوز ہے جب پردۂ سیمیں کا ہر منظر
سبق آموز ہو سکتا ہے یہ تیرے لئے کیونکر
مجھے خطرہ ہے تو شیطان کا بندہ نہ ہو جائے
کہیں گندے تماشے دیکھ کے اندھا نہ ہو جائے

کھانے کی آمد آمد نے اس دلچسپ گفتگو کو ختم کرنے کی دعوت دی،

کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ہازل صاحب نسیم دکلام سیفی کیف رضوی، رنگین اور خنداں صاحب بارہ بنکوی تشریف لے آئے میں نے ہنس کر کہا یہ گویا بین الاقوامی متحدہ اور متفقہ حملہ ایک پردیسی مسافر پر براہ راست کیا گیا ہے کیا عجب ہے کہ مسلح بھی ہو اور زمانۂ حال کے خوفناک اسلحہ ہر جیب کی زینت ہوں، سب نے مل کر قہقہہ لگایا اور کہنے لگے کیا کریں آپ کے حسنِ اخلاق نے کچھ جادو ہی ایسا کردیا ہے جس کا کوئی توڑ نہیں، آپ سے ملے بغیر چین نہیں آتا، چائے، پان اور حقہ کا دور چلنے لگا، اگربتیوں کا پُرکیف دھواں ایک طرف اور چوسیرہ تمباکو کی بہار آفریں لپٹیں دوسری طرف کمرہ معطر اور دل و دماغ مسخر ہو گئے، آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہو گئے، کے حسب مصداق سرشار صاحب کی صدارت میں مشاعرے کی تجویز پیش کر دی گئی، سب نے تائید کی لیکن انہوں نے کہا میں سنجیدگی کے ساتھ بیٹھ نہ سکوں گا اور مجھے اپنا قائم مقام بنادیا اب گویا بارِ صدارت میرے ناتواں کاندھوں پر آ پڑا، معذرت کی مگر قبول نہیں ہوئی، میں نے مسندِ صدارت پر بیٹھتے ہوئے حرفِ اول کے طور پر کہا کہ غالباً آپ لوگوں کو مشاعروں کے سوا اور کوئی کام نہیں، سب ایک ساتھ ہنسنے لگے، سب نے ایک زبان ہو کر کہا نہیں یہ

بات نہیں ایک نہیں ہزاروں کام ہیں، لیکن چونکہ آپ ہمارے مہمانِ عزیز ہیں اس لئے آپ کی صحبت غنیمت جانتے ہیں ہم لوگ محض مشاعروں کے شاعر نہیں، ہم زبان و فن کے طالب علم ہیں محض غزل سرائی کیلئے وقت ضائع نہیں کرتے پھرتے، مہینوں کسی مشاعرے میں نہیں آتے جاتے لیکن مشقِ سخن کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں دیتے، اور ہر صنفِ سخن پر عبور حاصل کرنے کی تڑپ رکھتے ہیں، دوسروں کو محض اس لئے سنتے ہیں کہ یہ کیا کہتے ہیں اور ہم کیا کہتے ہیں، کس سے آگے ہیں اور کس سے پیچھے ہیں، میں نے کہا بڑے مبارک عزائم ہیں اور بہت عمدہ دستور العمل، ترقی کرنے کے یہی صحیح راستے ہیں، حصولِ فن کا جذبہ جن طالب علموں میں نہیں ہوتا وہ کچھ دور چل کر رہ جاتے ہیں منزل تک اُن کی رسائی نہیں ہو پاتی، اچھا تو مشاعرہ اب شروع ہو جانا چاہیئے، تمام حاضرین نے اپنا اپنا منتخب کلام سُنایا۔ میں نے ایک غزل سنائی دوبارہ فرمائش پر فصیح البیان حضرت علامہ شوقؔ قدوائی لکھنوی علیہ الرحمۃ کی غزل پر ایک خمسہ پیش کیا، جو بہت پسند کیا گیا یہ مجلسِ مشاعرہ کبھی نہ بھولے گی کیونکہ ہازل اور رنگین صاحبان نے مزاحیہ کلام سے اس صحبت کو غیر معمولی دلچسپ بنا دیا تھا۔

www.kitaabistan.com

دسویں دن علی الصبح مولانا محبوب علی صاحب سے ملنے گیا بڑی محبت سے علم وفن کی باتیں کرتے رہے، ذکر چلا کہ افسوس مرزا یاس یگانہ لکھنوی سے یہاں آکر بھی ملاقات نہ ہو سکی، مولانا نے فرمایا اتفاق کی بات ہے، "آب آمد تیمم برخواست" والا معاملہ ہے، بھوپال سے حضرت استادی قبلہ محوی مدظلہٗ کا آمدہ خط میں نے دکھایا، فرمانے لگے کہ آپ خوش قسمت ہیں کہ اُن کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کرنے والے ہیں، اور وہ آپ کے خلوص و ہمت کی قدر فرماتے اور آپ کے منتظر ہیں۔ مولانا نے بڑی فراخ دلفگی سے چائے پان سے تواضع فرمائی، اتنے میں معین صدیقی عثمانپوری بھی آگئے اور سرشار صاحب سے بے تکلفی کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے، اجازت لے کر ہم لوگ اُٹھے، سرشار صاحب اپنے دفتر اور معین صاحب اپنے مطب چلے گئے اور میں نے مکان پہنچ کر دوپہر کا کھانا فرید و سلمہا اور میاں شعیب سلمہٗ کے ساتھ کھایا، درمیان میں بھائی بہن میں چھین جھپٹ بھی ہوتی رہی، اگر ایک نے حلوے کی قاش پار کردی تو دوسرے نے برفیوں کی قاشیں جھپٹ لیں، اگر یہ چیزیں کافی مقدار میں نہ ہوتیں تو شاید مجھے شکست کا منھ دیکھنا پڑتا، لیکن یہ دونوں اپنی پسند کی چیزیں زیادہ

سے زیادہ مجھے کھلانے پر اپنی چیرہ دستی صرف کرتے رہے، کھایا کم اور کھلایا زیادہ، کچھ دیر استراحت کرنے کے بعد میں سرشار صاحب کے دفتر میں پہنچ گیا، وہاں سے ہم دونوں خراماں خراماں امین آباد پارک پہنچے، مولانا محوی مدظلہٗ کے لئے احمد حسین دلدار حسین کی دوکان سے تمباکو خوردنی کا ایک چھوٹا ڈبہ خریدا، اور ریکشا لے کر مکان واپس آگئے، شام کا کھانا کھا کر ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ محلہ کی چار مینار مسجد کے پاس مولانا عبد الحفیظ صاحب کے زیرِ صدارت ایک صاحبِ ثروت کے دولتکدے پر ایک مذہبی اجتماع ہو رہا تھا، کہ مولانا سرشار کا بلاوا آیا، وہ تشریف لے گئے، میں مطالعہ میں مصروف ہو گیا، چند لمحے بعد میں بھی طلب کیا گیا، جھٹ پٹ کپڑے پہن کر حاضرِ مجلس ہو گیا، کچھ دیر محلہ کی مسجد کی تعمیر و مرمت اور ضروری انتظامات کے متعلق حاضرین میں بات چیت ہوتی رہی، پھر چند آیاتِ قرآنی کا ترجمہ کیا گیا، کچھ سرکارِ رسالت کا ذکرِ خیر ہوا اور اس کے بعد حاضرین نے مولانا سرشار کی خدمت میں استدعا کی، کہ ایک نعت فرمائیے، چنانچہ سرشار صاحب نے اپنے مخصوص والہانہ انداز میں نعت فرمائی، مجمع تڑپنے لگا، مجھے بھی اشارہ ہوا میں نے بھی ایک نعت عرض کی، سننے والے بیتاب ہو گئے، درود و سلام کی ہر جہار طرف

سے بارش ہونے لگی، اس کے بعد پھر سرشار صاحب نے حسبِ فرمائش سوز بھری لے میں ایک اور معرکتہ الآرا نظم پیش کی اب سماں ہی کچھ اور تھا، ایک مطلع اور ایک شعر آپ بھی تبرکاً سُن لیں ؎

مکّے سے جب آ بیٹھے سرکار مدینے میں
کعبے کے چلے آئے انوار مدینے میں

یہ شانِ مدینہ ہے سرکار کی خاطر سے
جبریل امیں آئے سو بار مدینے میں

کیا کفر کی تاریکی سر اپنا اُٹھا سکتی
چلتی ہے تجلّی کی تلوار مدینے میں

ازاں بعد میں نے بھی حسبِ الحکم ایک نعت فارسی زبان میں عرض کی، رات کے ۱۲ بجے کے قریب یہ مجلسِ خیر و برکت ختم ہوئی، اور مکان پر واپس آتے ہی سو گئے۔

گیارہویں دن علی الصبح میں نے سرشار صاحب کے دفتر جانے سے قبل عرض کیا کہ مولانا آج مجھے بھوپال جانے کی اجازت دیں کیونکہ ایک ہفتہ کے پروگرام سے تین دن زیادہ ہو گئے ہیں، فرمانے لگے کیا جی بھر گیا، اماں دو تین دن اور رہو، ہنستے ہوئے نیچے زنانخانہ میں تشریف لے گئے اور چچی جان سے میرا ارادۂ رخصت ظاہر کر کے چائے کی ٹرے

لئے ہوئے واپس آئے، میں نے زور دیا کہ بس زیادہ سے زیادہ کل تک اور حاضر رہوں گا، ابھی بھوپال کا طویل سفر درپیش ہے، علامہ محوی مدظلہٗ کی خدمت میں پہنچنے کی آرزو ہے، وہ دفتر جانے کی تیاری کرنے لگے میں بھی تیار ہو گیا۔ وجہ پوچھی، عرض کیا کہ آپ کے ساتھ ایک تصویر کھنچوانے کو جی چاہتا ہے، بہت اچھا کہہ کر نیچے آئے، ہزارے میاں کو جو صحن میں مرغیوں کے ٹاپے کے پاس کھیل رہے تھے میں نے از راہِ مذاق کہا کہ ہزارے میاں کہاں ہیں ہم اُن کو مُرغا بنا کے ٹاپے میں بند کریں گے، جھٹ بول اُٹھے، کہ شاد صاحب ہم آپ کو مُرغی بنا کر ٹاپے میں بند کریں گے اور انڈے دینا بھی سکھائیں گے، پھر دونوں مزے سے کھائیں گے، سب اہلِ خانہ اور میں اس حاضر جوابی پر ہنسنے لگے، خواتین نے بھی لطف لیا، سرشار صاحب نے اُنھیں نالائق کہہ کر چشم نمائی کی کوشش کی اور وہ قہقہے لگاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہم لوگ مکان سے باہر آئے ۔۔۔۔ مع معین بھائی کے نخاس بازار پہنچے ایک فوٹو گرافر کی دُوکان پر جا کر فوٹو لیا اور تاکید کی کہ کاپیاں آج ہی مل جانی چاہئیں۔ فوٹو گرافر نے عذر کیا کہ کام کی زیادتی کے باعث مجبوری ہے آج تو نہ مل سکیں گی، میں خاموش ہو گیا، سرشار اور معین بھائی اپنے اپنے کام پر چلے گئے، میں نخاس بازار سے سیدھا حضرت شاہ مینا علیہ الرحمتہ کے مزارِ پُرانوار پر حاضری دینے چلا گیا، وہاں سے مختلف پُررونق بازاروں سے ہوتا ہوا دوپہر کو مکان واپس پہنچا اور کھانے سے

فراغت حاصل کر کے سو گیا، شام کو حسبِ معمول یارانِ طریقت تشریف لے آئے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد بیت بازی شروع ہو گئی۔ خوب جی بھر کے سُنا اور جی کھول کے سُنایا، اگلے روز الوداع کہنے کی خبر سُنکر سب ہی متاسف اور آبدیدہ ہو گئے، کہنے لگے آپ کو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا، مگر کیا کہتا اور کیا کرتا، آخر ایک نہ ایک دن تو جانا ہی ہے آج نہیں تو کل۔

بارہویں دن امین آباد کے بازار سے ایک سنگ (ہیچوان) اور بچوں کیلئے چند کھلونے خریدے اور گھر پر آ کر اداس سو گیا، سرشار صاحب شام کو دفتر سے تشریف لے آئے مگر انتہائی مضمحل اور افسردہ مَیں بھانپ گیا، اشارتاً پوچھا خیر باشد، جواب ملا کہ آج پورے گھر میں آپ کے جانے کے اثر سے خاموشی اور اُداسی چھا رہی ہے، میری آنکھوں سے آنسو آ گئے، اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں، شام آئی، کھانا آیا، کچھ کھایا کچھ باندھا اور تیار ہو کر مع سامان اسٹیشن جانے کیلئے تیار ہو کر نیچے آئے، حضرت سرشار نے نچی جان کے ہاتھ سے امام ضامن لے کر میرے دائیں بازو پر باندھا۔ میں نے خوشی خوشی بندھوایا۔ معاً یہ شعر زبان پر آ گیا۔ ؎

میرے بازو پہ جو سرشار نے ضامن باندھا
میں یہ سمجھا سفرِ ہند کا آمن باندھا

دل بھر آیا، اور بے اختیار زار زار رونے لگا، میری اچھی اور مہربان چچی

نے بھی رونے میں میرا ساتھ دیا، اس ماحول سے متاثر ہوئے بغیر کوئی نہ رہا، بالآخر جی کڑا کر کے بچوں کو دعا اور پیار دے کر سب سے رُخصت ہوا اور مع سرشار صاحب کے اسٹیشن پہنچ گیا، دیکھا تو کلام صاحب پہلے ہی سے پلیٹ فارم پر موجود تھے، ٹکٹ خریدا گیا، ٹرین آئی، اور ہم اس میں بیٹھ گئے، لکھنؤ کے شاندار اسٹیشن پر ایک آخری نظر ڈالی، سیٹی ہوئی اور سرشار و کلام صاحب سے معانقہ کے بعد آبدیدہ ہو کر بھوپال روانہ ہو گیا +

شاد قدوائی
۱۲ دسمبر ۵۶ء

لکھنؤ سے بھوپال تک

لاہور سے لکھنؤ پہنچ کر شاہانِ اودھ کا بسایا اور سنوارا ہوا عالیشان شہر اور تاریخی شاہی عمارتوں کے خوشنما اور فراخ بازاروں میں متواتر گیارہ دن سیر و تفریح کرنے کے بعد جناب سرشار کسمنڈوی اور بیگم سرشار سے رخصت ہوئے لکھنؤی تہذیب و رواج کے مطابق بہ کمالِ عقیدت جناب سرشار اور بیگم سرشار نے مجھ مہمانِ عزیز کے بازو پر امام ضامن باندھا، معاً یہ شعر زبان پر آ گیا ؎

میرے بازو پہ جو سرشار نے ضامن باندھا
درحقیقت سفرِ ہند کا آمن باندھا

www.kitaabistan.com

جدائی کے صدمے سے میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں، فرودگاہِ سرشارؔ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا جہاں میری زندگی کے ۱۱-۱۲ دن بڑے لطف و مسرت اور انتہائی آرام و آسائش سے گذرے تھے، بیگم سرشارؔ بھی متاثر ہوکر رو پڑیں اور مجھے دعائیں دینے لگیں، قبلہ سرشارؔ، معین بھائی، بھاوج اور عزیزہ فریدہ اور میاں شعیب سلمہٗ عرف ہزارے میاں سب حسرت زدہ ہو گئے، مگر میں دل کو مضبوط کرتے ہوئے ان کرمفرماؤں اور عزیزوں سے رخصت ہو گیا۔ جناب سرشارؔ اور کلام صدیقی بہ کمال خلوص و محبت اسٹیشن تک مجھے الوداع کہنے تشریف لائے، بشرطِ صحت و زندگی دوبارہ ملاقات ہونے کی امید میں آبدیدہ ہوکر مہمان نوازی کا شکریہ ادا کر کے ۱۳ رفروری ۱۹۵۶ء کو ۸½ بجے شام حضرت علامہ محوی صدیقی لکھنوی کی خدمت میں حاضر ہونے کیلئے عازم بھوپال ہو گیا۔

ڈاک گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی چلی، میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے، دل کچھ ڈوبا ڈوبا سا تھا، تقریباً ایک گھنٹہ کی مسافت طے کرنے کے بعد میرے آنسو تھمے، دل کچھ ٹھہرا، ہوش و حواس بجا ہوئے، آخر آہستہ آہستہ مجھے صبر و قرار آگیا، چڑھا دریا اترا، سوچا کہ اب میں اردو علم و ادب کے عظیم محسن اور ذی شان شخصیت، ہندوستان کے شاعرِ اعظم استاذی حضرت قبلہ علامہ محوی صدیقی لکھنوی مدظلہٗ العالی کی خدمت میں شرفِ نیاز حاصل کرنے کیلئے جا رہا ہوں، جن کا آج تک اصالتاً شرفِ نیاز حاصل نہ تھا، البتہ وقتاً فوقتاً ملک کے مؤقر رسائل میں اُن کی تصاویر ضرور نگاہ سے گذرتی رہی تھیں اور کچھ میرے

پاس محفوظ تھیں، جب علامہ موصوف کا قیام بطور لکچرار، لکھنؤ۔ کانپور۔ دہلی، قصور، عثمانیہ یونیورسٹی اورنگ آباد دکن اور مدراس یونیورسٹی میں تھا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ خدمتِ عالی میں حاضر ہوکر سعادتِ نیاز حاصل کروں مگر آج تک ایسا نہ ہو سکا تھا، زہے قسمت کہ آج ـــــ میں اُن کی خدمت میں بخیر و عافیت قدمبوسی کے جذبے سے سرشار جا رہا تھا، تمام رات ہندوستان کے مشہور و قابل دید شہروں اور مقامات کے اسٹیشنوں سے ٹرین گذرتی رہی، ہر نام میرے لئے نیا تھا، سب کے دیکھنے کی حسرت دل میں لئے ہوئے ایک حسرت بھری نظر ڈالتا رہا۔ یہ سب کچھ ایک طرف۔ اور دوسری طرف علامہؔ موصوف کا اشتیاقِ دیدار غالب تھا، اسی خوشگوار کشمکش میں صبح نمودار ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے دوپہر آگئی۔ کافی ڈھلوان پہاڑی مقامات سے گزر کر ایک بجے دوپہر کو خدا خدا کر کے بھوپال اسٹیشن آیا۔ ازدیادِ شوق میں کچھ اور شدت پیدا ہو گئی، قلی کو آواز دی اور اپنا بے جان ساتھی چرمی سوٹ کیس اس کے حوالہ کیا، آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر چل رہا تھا کہ عین وسط میں علامہ موصوف سیاہ شیروانی، سفید پاجامہ اور دوپلی ٹوپی پہنے چشمہ لگائے ہاتھ میں چھڑی لئے برآمدہ میں کھڑے نظر آئے، میں نے پہچان کر قدمبوسی کی اور معانقہ کیا، خیریت پوچھی، جلدی سے اپنے منجھلے فرزند جمیلؔ میاں اور ایک شاگرد مولانا تسنیمؔ کو پکارنے لگے، معلوم ہوا کہ یہ دونوں صاحبان میری تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں یہ حضرات ہمارے پاس آگئے، مولانا موصوف نے خندہ پیشانی کے ساتھ فرمایا کہ بھئی آپ لوگ کہاں پھرتے رہے۔ یہ تو شادؔ آگئے۔ تعارف ہوا،

مصافحہ کیا اور اسٹیشن سے باہر آکر ایک تانگہ میں سوار ہو کر بھوپال کے خوبصورت اور پُر رونق بازاروں سے گذرتے ہوئے عین شہر کے وسط میں محلہ گوجر پورہ کے چوک میں تانگہ رُکا۔ سامان اتروا کر ایک گلی میں ہو لئے۔ ۲۵۔ ۳۰ قدم پر حضرت مولانا کا دولت خانہ آگیا۔ اوپر دیوان خانے میں پہنچ کر بیٹھ گئے۔ ایک کمرہ کتب خانہ کے طور پر نظر آیا۔ اتنے میں حضرت مولانا کے چھوٹے صاجزادے منیر حسین عرف منن میاں، چھوٹی پیاری بچی نورجہاں عرف بنّو اور بڑے لڑکے سعید میاں خوشی خوشی آگئے، مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے، سلاموں کا تبادلہ ہوا، وہیں ایک بزرگ صورت مگر بیمار مولانا منظور پہلے سے تشریف فرما تھے، حضرت قبلہ نے ان سے تعارف کرایا۔ مولانا منظور فرمانے لگے کہ بیماری میں اگرچہ مجھے چلنے پھرنے کی اجازت نہ تھی مگر آپ کے شوقِ دیدار میں کشاں کشاں یہاں تک آگیا۔ ذرا بھی سکت ہوتی تو استقبال کیلئے علامہ کے ساتھ اسٹیشن تک آتا۔ میں نے اُن کی طرف بہ نظر تشکر دیکھا، اور بندہ نوازی کا ممنون ہوا۔ علامہ موصوف کی خدمت میں میں نے رقت آمیز لہجہ میں عرض کیا کہ حضرت براہِ مہربانی میرے بازو پر بندھا ہوا جنابِ سرشار کا امام ضامن اپنے دستِ مبارک سے کھول دیجئے۔ مولانا موصوف نے خوش ہو کر اور دعائیں دے کر کھول کر پاس ہی بچھی ہوئی میز پر رکھ دیا ــ اور سعید میاں کو حکم دیا کہ کھانا لاؤ۔ سفر کی تکان اور کچھ بھوک کم ہونے کیوجہ سے عرض کیا کہ اِسوقت کھانا نہ کھاؤنگا، سب نے اصرار کیا کہ اکٹھے بیٹھ کر کھانے میں برکت ہوتی ہے، جتنا جی چاہے کھائیے۔ کیونکہ ہم سب نے آپ

کے انتظار میں کھانا نہیں کھایا۔ یہ سُنکر مجھے "بہت اچھا" کہنا پڑا۔ اس کے بعد مولانا تبسم یوں گویا ہوئے کہ پیشگی اطلاع اور بیان کردہ حلیہ کے مطابق چونکہ آپ نے سیاہ سرمئی رنگ کی شیروانی اور سُرخ رومال، سر پر خاکی ہیٹ نہیں پہن رکھا تھا اس لئے جمیل اور میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔ عرض کیا کہ میں نے اس خیال سے کہ شاید حضرت مولانا پیرانہ سال ہونے کیوجہ سے اسٹیشن تشریف نہیں لا سکے اِس لئے ان باتوں کا خیال نہ رکھ سکا، مگر میں مطمئن تھا کہ تانگہ لے کر گوجر پورہ پہنچ جاؤں گا دوسرے چونکہ امام ضامن بندھا ہوا تھا اس لئے شیروانی پہننا مناسب نہ سمجھا کوٹ ہی پہنے رہا۔ اور کچھ گرمی کا اثر کہئیے یا فیشن کی عادت ہیٹ بجائے سر کے ہاتھ میں تھا، دوسرے ہاتھ میں سُرخ رومال حسبِ اطلاع موجود تھا، البتہ دل کے کونے میں ایک خفیف سی فکر اس کی ضرور تھی کہ حضرت علامہ خدانخواستہ کچھ علیل نہ ہو گئے ہوں، اس عمر میں مزاج تولہ، ماشہ ہو جاتا ہے اور پھر ایک شاعر اور ایک ادیب کا مزاج، یہ سُن کر علامہ موصوف کے لبِ مُبارک پر ایک پُر خلوص مگر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی، میری طرف نہایت غور و پیار سے دیکھ کر فرمانے لگے کہ الحمدللہ اچھا تھا، بے شک ہونہار، کامگار اور تابع فرمان روحانی فرزندوں کے دل میں ایسا خیال آجانا ایسے موقع پر تعجب خیز نہیں، اور آپ نے تو خاص طور پر ہر حالت میں مدتہائے دراز سے میرا ہر طرح کا خیال رکھا ہے، آپ کی شرافتِ طبع کا خلوص و محبت کی روشنی میں جب کبھی تجزیہ کرنے بیٹھا تو ہمیشہ پاکیزگی اور وارفتگی کا نمونہ نہیں سرچشمہ نظر آئی،

www.kitaabistan.com

جس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں اور اکثر مواقع پر اپنے بے تکلف دوستوں اور اچھے شاگردوں سے مزے لے لیکر اس کا ذکر بھی کر چکا ہوں، اللہ کریم آپ کو شاد و بامُراد رکھے۔ یہ میرے لئے فخر و مباہات کا باعث ہے کہ میری رُوحانی اور معنوی اولاد میں سے پنجاب میں خاص طور پر مجھے آپ سے بے لوث محبت اور رجحان رہا ہے، اور آپ اب خدا کے فضل وکرم سے صبر آزما منزلوں سے گذر چکے ہیں، خدا آپ کو اور ہماری بہو راحت سلمہا اور بچوں کو تندرست رکھے، میں ہمیشہ دست بدعا رہا ہوں، خوش قسمتی ہے کہ زندگی کے اِس آخری دَور (بڑھاپے) میں آپ سے ملاقات ہو گئی ہے مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے، ایسی خوشی جسے بیان کم اور محسوس زیادہ کیا جاسکتا ہے، زبان میں اتنی گویائی کہاں کہ دل کی بات کا احاطہ کر سکے، علامہ صاحب نے یہ الفاظ ختم کر کے میری طرف دیکھا، میں خدمتِ عالی میں دوزانو بیٹھا بیٹھا آنسو بہا رہا تھا، اتنے میں جمیل اور سعید بھائی کھانا لے آئے، علامہ صاحب کے سامنے بچھی ہوئی سفید چاندنی پر مولانا تسنیم اور مولانا منظور کے ساتھ کھانا کھایا، پھر حکم ہوا کہ میں کچھ آرام کر لوں، بالاخانہ کے ایک دوسرے ہوادار کمرے میں پلنگ پر جا کر لیٹ رہا اور مولانا اندر خانہ تشریف لے گئے۔

تقریباً تین گھنٹہ مسلسل سونے کے بعد پانچ بجے میری آنکھ کھُلی، حضرت علامہ کے خاص کمرے اور کتب خانہ کے دروازے پر ایک سفید چاک سے میں نے یہ شعر لکھ دیا ؎

خوشا نصیب کہ پہنچا میں آپ کے در تک
زہے نصیب کہ دیکھی جناب کی صورت

اس کے بعد میں نے سگریٹ سُلگایا، پیا اور ایک عجیب و غریب رُوحانی مسرت میں سرمست ہو گیا، یہ کیف ابھی زائل نہیں ہوا تھا کہ منّن میاں آئے اور میز پر چائے کا سامان چُننے لگے، اتنے میں حضرت مولانا تشریف لے آئے اور میں ادب سے کھڑا ہو گیا۔ فرمایا "آیئے چائے پی لیں"، تعمیلِ ارشاد کی گئی، پان کی دو گلوریاں منہ میں رکھیں، اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں، میرے بڑے بھائی صاحبزادہ محمد معراج الدین شامی جالندہری، خان رسا جالندہری، انجم رضوانی مقیم راولپنڈی کی خیریت پوچھی، سب دوستوں کے حُسنِ سلوک اور مراسم سُنکر خوش ہوئے، اس کے بعد فرمایا کیا سیر کو جائیے گا، عرض کیا کہ ضرور مگر مشروط، مولانا نے حیرت سے استفسارِ شرط فرمایا، گذارش کی کہ مرحوم دوست شریف فکری اور استاد بھائی ملّا رموزی مرحوم کے مزارات پر پہلے فاتحہ خوانی کا خیال ہے اور اُس کے بعد کسی اور جگہ سیر کو چلیں گے، مولانا نے میرے اِس جذبہ کو سراہا، چنانچہ دیوان خانہ سے حضرت علامہ کی معیّت میں نکلا، ہم چند لمحوں میں دو تین پُر رونق بازاروں سے ہوتے ہوئے مرحوم شریف فکری بھوپالی کے مکان واقع اندرون اتوارہ پہنچے، مکان بند پایا۔ اُس کے بالمقابل اُن کے بھتیجے جناب اختر سعید اور اظہر سعید صاحب وکیل کے دیوان خانہ میں داخل ہوئے، علامہ صاحب کے ہمراہ مجھے آتا دیکھ کر دونوں بھائی اور اُن کے

ایک اور دوست پروفیسر مسعود صاحب نے ہمارا خیر مقدم کیا، اُن سب سے متعارف ہوا، میری شکل وصورت دیکھ کر فرمانے لگے کہاں یاد آیا۔ واقعی آپ قابلِ قدر آدمی ہیں عرصہ سے مرحوم چچا جان سے آپ کی خط وکتابت تھی۔ اپنا ارادہ ظاہر کیا، چنانچہ معاً فکریؔ مرحوم کے صاحبزادہ اسد میاں کو بلایا گیا۔ اُن کو ہمراہ لے کر بس اور مولانا چند لمحوں میں فکریؔ مرحوم کے مزار پر پہنچے، میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، کہ زندگی میں تو ملاقات کی حسرت ہی رہی، اور آج میں اُن کی وفات کے کافی عرصہ بعد مزار پر فاتحہ خوانی کر رہا ہوں، فاتحہ خوانی کے بعد رومال سے آنسو پونچھ کر بہوت کھڑا رہا، یہ نہ پوچھئے کہ کیا سوچ رہا تھا پاؤں میں چلنے کی طاقت نہ تھی، بے ساختہ یہ شعر زبان پر آگیا ؎

جب کبھی یاد آئی تیری ہو گیا ہوں اشکبار
تیری فرقت میں رہا کرتا ہوں اکثر بے قرار

غالباً اسد میاں نے یہ شعر نوٹ بھی کر لیا تھا۔ مزار سے واپسی پر اسد میاں ایک ضروری کام کی وجہ سے چلے گئے۔ میں اور علامہ صاحب مختلف صاف وکشادہ سڑکوں کو عبور کرتے ہوئے چھاؤنی محلہ کے نکڑ پر پہنچے۔ ایک مکان کی طرف مولانا نے اشارہ کر کے فرمایا، یہی ہمارے ملاؔ رموزی مرحوم کا مکان ہے، یہیں گلابی اُردو پیدا ہوئی اور یہیں دفن بھی ہوئی، وہ گلابی اُردو جس کی ملک بھر میں گونج تھی، مانگ تھی، چاٹ تھی، جس اخبار یا رسالہ میں اُن کے مقالے عموماً شائع ہوا کرتے تھے لوگ ان کے خریدنے اور

پڑھنے کیلئے بیقرار رہتے تھے، ہر طرف ملاؔ کی گلابی اُردو کا طوطی بول رہا تھا اُسی نے اُن کی شہرت، عظمت اور شخصیت میں چار چاند لگائے، آخر وقت میں نظمیں اور غزلیں بھی کہنے لگے تھے، اُن کے ذوقِ سلیم کے نمونے کلامِ منظوم میں بھی بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ بکثرت ملتے ہیں، بہت سی باتوں میں وہ شعراء عصر سے بہت آگے نظر آتے تھے، جہاں وہ ایک باشعور ادیب، سلیقہ مند مفکر تھے وہاں اُن کے سیاسی رجحانات بھی قیامت کے تھے، چنانچہ اُن کے مقالے زیادہ تر سیاسی حالات اور واقعات ہی پر مشتمل ہوتے تھے پھر ملاؔ کا اندازِ بیان حریفوں اور حاسدوں کو بھی تڑپا دیا کرتا تھا، "خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھی مرنے والے میں"، خیر میں نے ملاؔ کے مکان پر دستک دی، ایک چھوٹا، خوبصورت، ہوشیار سا بچہ باہر آیا، مولانا نے اُس سے پیار سے پوچھا، معلوم ہوا کہ یہ نونہال ملاؔ رموزی مرحوم کا بھانجا ہے، پھر پوچھا کہ تمہارے ماموں جان مرحوم کی کونسی قبر ہے، بالکل قریب ہی چند قبروں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ ہے۔ کہا بیٹا آگے بڑھو اور ہمیں دکھا دو، وہ لڑکا نہایت ہوشیاری اور سنجیدگی سے سامنے چند گز کے فاصلے پر تین چار قبروں کی طرف بڑھ کر اور ایک قبر کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارے سے کہنے لگا کہ یہ رہی ہمارے ماموں جان کی قبر، یہیں وہ سو رہے ہیں اور اب ہماری کسی بات کا جواب نہیں دیتے، ایسے خفا ہوئے ہیں کہ نہ رونے سے پسیجتے ہیں نہ بے مہری کے شکوے شکایت سے پگھلتے ہیں، پاس ہی ایک مکان کے دروازے پر دستک دے کر مولانا نے اُس کی تصدیق

کرلی وہی قبر ہے جس کی نشاندہی بچے نے کی ہے، چنانچہ میں بصد حسرت و یاس فاتحہ خوانی میں مصروف ہوگیا۔ فارغ ہونے پر معلوم ہوا کہ قبر کی تصدیق کنندہ ملّا رموزی کی سوگوار ہمشیرہ تھیں، میری زبان پر یہ شعر آگیا ؎

مَیں تیرے جینے سے تھا مجبور جینے کیلئے
زندگی ہے اب لہو کے گھونٹ پینے کیلئے

یہاں اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم ملّا رموزی سے ۱۹۲۹ء میں میرے مراسم بذریعہ ترسیل تھے، اور ان سے ۱۹۳۱ء میں مجھے شرفِ نیاز حاصل ہوا تھا، جب وہ اپنی تصنیف "عورت ذات" کی اشاعت کے سلسلہ میں لاہور آئے تھے، اور واپسی پر "بھوپال سے لاہور تک" کے سفرنامہ میں میرا ذکرِ خیر مرحوم نے اپنے خاص رنگ میں خوش اسلوبی سے کیا تھا، جو لاہور کے اخبارات میں کچھ عرصہ بعد شائع ہوا تھا، مرحوم نے عمر کے آخری دور میں شاعری بھی بڑے اہتمام سے کی تھی اس کا ذکر کسی دوسری جگہ کرچکا ہوں، مگر افسوس کہ اُن کی زندگی نے وفا نہ کی، وہ عمرِ طبعی کو نہ پہنچ سکے اور ادبی دنیا کا یہ درخشندہ ستارہ ہمیشہ کیلئے بے نور ہوگیا۔ ہم آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے لوٹ رہے تھے کہ ایک خوشنما اور پُرفضا سیر گاہ "کملا پارک" آگئی، ہم لوگ کچھ دیر کیلئے ٹھہر گئے۔ شام ہو رہی تھی، کچھ تھکن بھی تھی لیکن اس کے باوجود واپسی پر جناب ڈاکٹر گوہر چاندپوری، ڈاکٹر شفا گوالیاری، گوہر جلالی، نجمی سیہوری، باسط بھوپالی اور باسط آدجینی و طالب صاحب سے تعارف ہوا، ان سب حضرات سے مل کر بڑی

فرحت ہوئی، ہم سب علامہ صاحب کے دولتکدے پر آگئے، مولانا تسنیم اور مولانا منظور ہمارے انتظار میں تشریف فرما تھے، مختصر سا تبادلۂ خیال ہوا جو بڑا پُرلطف تھا، اس کے بعد میں کپڑے بدل کر اپنا سامان سنبھال رہا تھا کہ ڈاکٹر شفا گوالیاری فرمانے لگے کہ شاذ صاحب آئیے، آپ کے اعزاز میں مشاعرہ ہے سنبھل کر بیٹھئے، فوراً تعمیلِ حکم کرنا پڑی، جناب گوہر جلالی کی صدارت میں مختصر مگر دلچسپ مشاعرہ ہوا، اس میں تقریباً تمام شعراء نے حصّہ لیا، آخر میں علامہ نے اپنے کلامِ بلاغت نظام سے نوازا۔ طالب صاحب پریس کے رپورٹر اور نمائندہ ہونے کی حیثیت سے روداد لکھ رہے تھے، مشاعرہ ختم ہونے کے بعد سعید بھائی نے مقامی روزنامہ ندیم اور افکار کی دو دو کاپیاں حضرت علامہ کی خدمت میں پیش کیں، مولانا نے دیکھ کر کہا کہ طالب صاحب کی وساطت سے بھوپال میں شاذ کی آمد کی خبر دونوں اخباروں میں آگئی ہے، اخبارات ڈاکٹر شفا گوالیاری کی طرف بڑھا دیئے، انہوں نے پڑھ کر میری طرف سرکا دئے، میں نے بہ نظرِ استحسان دیکھ کر دیگر شعراء کرام کی طرف بڑھا دیئے۔ کیوں نہ ہو یہاں کی روایاتی تشان یہی ہے کہ ہر درجہ کے مہمان کی قدر افزائی کی جائے، تمام صاحبان یوں گویا ہوئے۔ اس کے بعد کچھ دیر تک پُرلطف ادبی باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ دیر بعد تمام حضرات رخصت ہوئے اور میں کھانا کھا کر سو رہا۔

دوسری صبح ناشتہ کے بعد باتیں ہو رہی تھیں کہ مولانا نجمی سیہوری، مولانا اقبال اور مقدس میاں تشریف لے آئے، تعارف ہوا، مولانا اقبال نے

بکمال نوازش ایک قومی نظم سنائی، جی خوش ہوا، معاوضہ کے طور پر علامہ صاحب کے فرمان پر میں نے ایک غزل اور ایک نظم پیش کی، جو پسند کی گئیں، اس کے بعد مولانا نجمی اور مقدس میاں نے بھی ایک ایک غزل سنائی، یہ دونوں حضرات سرشار صاحب کے قابلِ ذکر تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں، مولانا اقبال اپنے دفتر تشریف لے گئے اور مولانا نجمی و مقدس میاں سیہور چلے گئے۔ اس کے بعد میں اور علامہ صاحب ایک ضروری کام کیلئے بازار گئے۔ خوبصورت اور بارونق بازاروں میں گھومتے ہوئے متعلقہ کام کرکے جلدی واپس آ گئے، دوپہر کا کھانا کھایا، اس کے بعد سعید میاں پیتے کی قاشیں پلیٹ میں سجا کر لے آئے مولانا منظور چونکہ ناسازیٔ مزاج کے باعث کھانے میں شریک نہ ہو سکے تھے اِن قاشوں پر بے تکلفی کے ساتھ لپکے اور مزے سے کھانا شروع کر دیا۔ میں بھی آہستہ آہستہ کھا رہا تھا، علامہ صاحب نے فرمایا کہ یہ پھل مولانا کوثر یزدانی آپ کے اُستاد بھائی نے آپ کی آمد پر منہاڑ سے بذریعہ پارسل بھیجا ہے، پھر حقہ اور پان کا دور چلا، ایک گھنٹہ کے قریب پُر لطف باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد میں سو گیا۔

عصر کے بعد سو کر اُٹھا، حسبِ معمول چائے نوشی کے بعد علامہ صاحب کے ہمراہ سیر کو چل کھڑا ہوا، بھوپال کے مشہور و معروف چھوٹے بڑے تالابوں (جھیلوں) کا نظارہ کیا، ہر منظر خلد نظر معلوم ہوا، ایک اونچی پُر فضا سیرگاہ میں بیٹھ گئے، دادا اُستاد حضرت علامہ شوق قدوائی علیہ الرحمۃ کے سوانح سے مطلع ہوا، جنہوں نے فنِ شعر میں اپنے دورِ حیات

ہی میں پورے ملک سے لوہا منوایا تھا، واپسی میں دفتر اخبار "افکار" کی جانب سے گزر رہے تھے کہ طالب صاحب نے دیکھ لیا، لپک کر آئے اور علامہ صاحب کی خدمت میں دو پرچے پیش کئے، جن میں شب گذشتہ کی مفصل روداد اور مزارات ملا رموزی و فکری پر جا کر فاتحہ خوانی کی خبر بھی چھپی تھی، میں نے طالب صاحب اور مدیران اخبارات افکار و ندیم جناب محمود الحسینی اور رشدی صاحب کی قدر افزائی اور مہمان نوازی کا مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا، مجموعی طور پر بھوپال میں میرا قیام گیارہ دن تک رہا۔ اور ہر روز دیر سویر کہیں نہ کہیں محفلِ مشاعرہ جم جاتی، کبھی میاں عبد الصمد صاحب ریٹائرڈ تحصیلدار کے ہاں، کبھی وکیل اور شاہد صاحب کے ہاں کبھی عابد راشدی، اختر سعید اور اظہر سعید صاحب کے دولتکدہ پر، ڈاکٹر شفا گوالیاری، کوثر چاندپوری، اختر عزیز صاحب پنشنر ناظم مالیات پروفیسر ست پرکاش صاحب سنگھر، پروفیسر شہاب صاحب، مولانا اقبال اور جلیل انصاری کی شاندار حویلیاں اور ایوان بھی اِن دوستانہ اجتماعات سے محروم نہیں رہے، ہر نشست کوئی نہ کوئی خصوصیت اور نیا پن رکھتی تھی، خاطر و مدارات میں ہر جگہ جدت نظر آئی، وسیع النظری اور کشادہ دلی کا ہر جگہ مظاہرہ ہوا، ان کے علاوہ صدر منزل اور جہانگیر آباد وغیرہ میں ہونے والے مشاعروں کے بھی دعوت نامے آئے، کثرت سے چائے نوشی کی دعوتیں آئیں، کئی جگہ کھانے پر بھی مدعو کیا گیا، غرضیکہ ہر روز کچھ نہ کچھ ہوتا رہا۔ میں نے حضرت علامہ محوی صدیقی لکھنوی کی معیت میں

سرشار کسمنڈوی　　　　عمانؔ قدوائی

اپنا ناچیز کلام سنایا، اور ہر جگہ شعرائے عصر کا بلند پایہ اور ترقی یافتہ کلام سُنا۔ ایک دن "حلقۂ دانشوراں" کے اجلاس میں شریک ہو کر شب کے ۸ بجے سے صبح کے ۵ بجا کر اُٹھا، یہاں مختلف پروفیسروں اور ادبی شخصیتوں سے اُردو فارسی کے علاوہ ہندی اور سنسکرت کے بلند پایہ ادیبوں کے مقالوں اور کلام سے محظوظ ہونے کا موقع ملا، اس اجلاس کے منتظم پروفیسر سنگھر صاحب کے حسنِ انتظام سے جی خوش ہوا، آخر میں علامہ محوی صدیقی لکھنوی مدظلہ العالی نے اُردو علم و ادب پر ایک مختصر مگر جامع تقریر فرمائی، اپنی تقریر میں آپ نے اس امر پر زور دیا کہ اُردو فارسی کے علاوہ اہلِ ذوق اور طالبانِ فن کو دوسری زبانوں کے علم و ادب سے بھی استفادہ کرنا چاہیئے، اہلِ ذوق اور طالبانِ فن کو دوسری زبانوں کے نوادرات اپنی زبان میں خوش اسلوبی کے ساتھ منتقل کرنے چاہیں، اُردو کو اور زیادہ ہر دلعزیز بنانے کیلئے کسی قدر وسعتِ نظری سے کام لینے کی ضرورت ہے، فضول بحثوں میں اُلجھنے سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا، فی زمانہ ڈھول کی نہیں عمل اقدامات کی مانگ ہے اسے پوری کیجئے، اصرار پر آخر میں انہوں نے اپنا بلند پایہ کلام بھی سُنایا۔ آپ بھی چار یا پانچ اشعار سُن لیں۔ فرماتے ہیں ؎

مری دیوانگی جا کر اسیروں میں پکار آئی　　قفس کو توڑ ڈالو تم تو ہم سمجھیں بہار آئی
مصوّر کی نظر شاعر کا دل دونوں ہیں سجدے میں　　جوانی بن کے قدرت کا انوکھا شاہکار آئی
ابھی رگ رگ سے خونِ گرم کے جاری ہوں فوارے　　قفس میں دل اگر سُن لے گلستاں میں بہار آئی

نہیں کہتا کوئی "ہاں" پوچھتا پھرتا ہوں محشر میں — بتاؤ تو محبت بھی کسی کو سازگار آئی
وہ آئے پھول کچھ آنکھوں نے کچھ دامن بھر لائے — یہ تو تربت میں ہم ہیں اور تربت پر بہار آئی

دورانِ قیام لکھنؤ اور بھوپال میں مجھے محسوس ہوا کہ غزل کا مقام نہایت بلند اور نزاکت آفریں ہوتا جا رہا ہے، شعرائے متعارفہ کے کلام خصوصاً غزل کو میں نے جدید قدروں سے آراستہ پایا، یہاں کا ہر ادیب و شاعر اور باذوق سامعین غزل کے دلدادہ ہیں، میں نے جب کبھی اپنی مرضی سے کوئی نظم، خمسہ یا رباعی پڑھی، فوراً فرمائش ہوئی کہ غزل سناؤں، اور بعض اوقات تو تابڑ توڑ دو دو اور تین تین غزلیں پیش کرنا پڑیں، میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ یو۔ پی میں غزل ارتقائی مراحل پر پہنچ کر نہایت لطیف اور نازک خیالوں میں پنپ رہی ہے، جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کر چکا ہوں کہ میں بھی صنفِ سخن میں غزل ہی کا دلدادہ ہوں، اور غالباً تمام اصناف میں غزل ہی کو بقائے دوام حاصل ہے، میں اُن تمام احباب اور قدر شناسوں کا شکر گذار ہوں جنہوں نے مجھ ایسے ہیچدان اور کم استعداد کو اپنی نوازشوں اور قدر افزائیوں کا مرکز بنائے رکھا۔ حضرت سرشار گسمنڈوی اور حضرت علامہ محوی صدیقی جیسے اردو علم و ادب کے عظیم محسنوں کا ممنون ہوں جن کی وساطت اور فیوض و برکات سے میری اس درجہ خاطر و مدارات اور قدر دانی ہوئی، اور جن کی عظمت کی وجہ سے مختلف دعوتوں اور یادگار اعزازی مشاعروں میں شرکت کرنے کا موقع ملا، اِن مجالس کی فضا اور یاد میرے لیے ہمیشہ قیمتی سرمایۂ حیات رہے گی، لکھنؤ میں حضرت سرشار اور بھوپال میں

علامہ محوی کے قیمتی اور نادر علمی، ادبی، اخلاقی اور فنی کتب خانوں سے حسب پسند مختلف کتابوں کا بڑے اطمینان سے مطالعہ کرنے کا فخر حاصل ہوا، اور اِن دونوں کرمفرماؤں سے بالمشافہ فنی بحثیں اور موشگافیاں ہوتی رہیں، علامہ صاحب کے خاص دوست خشی گوبند پرشاد آفتاب بی۔ اے سے بھی ایک دن ملاقات ہوئی، اُنہوں نے بکمال نوازش اپنی دو تصنیفیں "تجسسِ آب" اور "فلسفۂ حکمت" عنایت فرمائیں، یہ دونوں کتابیں ابھی زیر مطالعہ ہیں لیکن چند صفحات کا مطالعہ بھی یہ کہنے میں متامل نہیں کرتا کہ دونوں اپنے اپنے موضوع کے اعتبار سے علمی ہونے کے باوجود بڑی دلچسپ ہیں۔

گیارہویں دن رخصت ہونے سے قبل علی الصبح علامہ صاحب کے ہمراہ ایک فوٹو لیا پھر مولانا منظور کے بعد مولانا عبدالخالق، مولانا اقبال، نجمی اور مقدس میاں تشریف لے آئے، دوپہر کے کھانے کے بعد جب رخصت ہونے لگا تو محترمی ڈاکٹر کوثر چاندپوری اور پیکر اخلاص ڈاکٹر شفا گوالیاری جو صاحب دیوان بھی ہیں تشریف لائے۔ مجھے رختِ سفر باندھتا دیکھ کر بے تکلفی سے فرمایا کہ شاد آج ہم سے جدا ہو کر رہیں گے، یہ کہہ کر وہ علامہ صاحب کی طرف حسرت سے دیکھنے لگے، علامہ صاحب کے لبِ مبارک پر "ہاں بھئی یہ دن بھی آنا تھا" کے الفاظ تھرا کے رہ گئے، پھر فرمایا ان کے حسنِ طبیعت اور اخلاق نے سب کو گرویدہ بنالیا۔ جی تو یہ نہیں چاہتا۔ مگر مشیتِ ایزدی، دورافتادگی

اور وطن کی مجبوریاں اور ملازمت کی پابندیاں حائل ہیں، اِن کی سعادتمندی اور ہمت قابلِ ستائش ہے، اِن کے قیام سے ہم بہت خوش رہے، اِن کے دم سے ادبی محفلوں میں رونق رہی، ہمیں فخر و مباہات ہے کہ ہمارے معنوی فرزند پنجاب میں رہ کر اس قدر اچھی زبان لکھتے اور بولتے ہیں، اور فنِ شعر میں بھی پختہ ہیں، کیوں نہ ہو پنجاب نے جو اُردو علم و ادب کی بیش قیمت خدمت کی ہے وہ مانی ہوئی بات ہے، اللہ تعالیٰ اِن کو اور اِن کے بچوں کو خوش اور تندرست رکھے، انشا اللہ پھر ملاقات ہوگی، یار زندہ صحبت باقی۔

مولانا یہ فرما رہے تھے اور میں سامنے بیٹھا آنسو بہا رہا تھا، اس موقع پر مجھے انہیں کا ایک شعر بار بار یاد آرہا تھا، ؎

یہ تو ممکن ہے کہ مہماں ہوں وہ محوی ایک شب
ہائے کیونکر کر سکو گے صبح کو رخصت انہیں

میرے تاثرات کا اندازہ کرتے ہوئے حاضرین نے ڈھارس بندھائی، جو خود بھی حسرت زدہ نظر آرہے تھے، اتنے میں عزیزہ نور جہاں عرف بٹو اور جمیل بھائی اور سعید بھائی خاموشی سے آکر ایک طرف بیٹھ گئے، میں جواباً بہ مشکل اور بہ کوشش قدر افزائی اور مہمان نوازی کا شکریہ ادا کر رہا تھا کہ سعید بھائی سے مخاطب ہو کر مولانا نے اُن کو تانگہ لانے کا حکم دیا، وہ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد تانگہ لانے چلے گئے، اتنے میں چلبلے میاں منّن (منیر) دندناتے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ ہم بھی شاد صاحب کو رخصت کرنے اسٹیشن جائیں گے، مولانا نے بہ کمال خندہ پیشانی "ضرور چلیے" کہہ کر انہیں مسرور کر دیا، اس دوران

میں میں نے دیکھا کہ مولانا منظور چھوٹی میز کا سہارا لئے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں۔ میں جوتے کے تسمے باندھ رہا تھا، کہ مولانا منظور نے حاضرین کو متوجہ کیا اور فرمایا ؎

شاد سے مل کر ہوئے بھوپال والے شادکام
جا رہے ہیں یہ وطن لیکن رہے گا اِن کا نام
محفلیں شعر و سخن کی روز ہی سجتی رہیں
اِن کی شرکت سب کے دل پر بن گئی نقشِ دوام

یہ کہہ کر مولانا منظور نے ایک خوشنما سبز کاغذ کا ٹکڑا میری طرف بڑھا دیا۔ جس پر یہ قطعہ درج تھا، میں نے شکریہ ادا کر کے جیب میں رکھ لیا۔ سعید میاں نے آواز دی کہ تانگہ آگیا ہے، ہم سب علامہ صاحب کے جلو میں بالا خانہ سے نیچے اُترے تو بیچ چوک میں تانگہ پر سامان رکھ کر سوار ہو گئے۔ میں نے تمام حاضرین سے مصافحہ اور معانقہ کیا، اِس کے بعد محترم ڈاکٹر کوثر چاند پوری ڈاکٹر شفا گوالیاری اور دیگر کرم فرما تو رخصت ہو گئے، لیکن میں اور علامہ مع مولانا منظور و متین میاں کے ایک تانگہ پر سوار ہوئے دوسرے تانگہ پر سعید بھائی، جمیل بھائی، مولانا نجمی اور مقدس میاں بیٹھے اور حسین و خوش منظر بازاروں سے گزرتے ہوئے اسٹیشن پہنچ گئے، پلیٹ فارم پر برادرم اختر سعید صاحب وکیل نظر آئے، معلوم ہوا کہ میرے مرحوم دوست فکر جی کے بیٹے اسد میاں کی شادی کے پیشگی انتظامات کے سلسلے میں اِسی گاڑی سے کہیں جا رہے ہیں علامہ صاحب نے پاس ہی کھڑے ہوئے اختر سعید اور اظہر سعید کے والد بزرگوار حضرت حامد سعید خاں

بھوپالی صاحب سے تعارف کرایا، جو میری خوش قسمتی سے اُسی روز کہیں باہر سے تشریف لائے تھے، اور میرے دورانِ قیام میں بھوپال سے بہت دُور تھے، عین سعادت تھی کہ چلتے چلاتے اُن سے بھی شرفِ نیاز حاصل ہو گیا، یہ بھوپال کے بڑے بزرگ شاعروں میں گنے جاتے ہیں۔ اتنے میں ٹرین آئی، میں نے اپنے عزیز بھائیوں سے معانقہ کیا، یہاں تک کہ اس کا سلسلہ یکے بعد دیگرے حضرت علامہ تک پہنچا، اب نہ تابِ مصافحہ باقی تھی نہ ہمتِ معانقہ، دونوں آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں، علامہ نے محسوس کر لیا اور خود ہی آ کر لپٹا لیا اور تسکین آمیز باتیں فرمانے لگے۔

خدایا تیرا ہزار ہزار شکر ہے کہ میں ان بزرگوں اور بچوں سے مل کر سُرخرو ہوا، اور شربتِ دید سے دل کی پیاس اور نظروں کی تشنگی دور کرنے کے بعد بخیریت تمام رخصت ہو رہا ہوں، دل میں یہ خیال یکایک آیا کہ معلوم نہیں زندگی میں کب دوبارہ ملاقات ہو سکے، میں نے علامہ سے عرض کیا کہ قبلہ آپ کی دعائیں بہرحال ہمیشہ میرے شاملِ حال رہنا چاہئیں، فرمایا کوئی فکر نہ کرو انشاء اللہ پھر جلد ہی ملاقات ہو گی، گاڑی نے سیٹی بجائی اور آخری سلام و دُعا کے بعد ہم ایک دوسرے کی نگاہ سے دُور ہو گئے، اُدھر ٹرین پوری رفتار پر آئی اِدھر دل کی دھڑکنیں اپنے تاثرات کا خاکہ مرتب کرنے کی دعوت دینے لگیں، .... براہ آگرہ تمام رات سفر کے بعد بھوپال سے دہلی پہنچا۔ دو دن دہلی کے سیر میں گزارے، جامع مسجد دہلی میں تین وقتوں کی نماز پڑھنے کی سعادت حصہ میں آئی، کیا تعریف ہو اس مسجد کے نقش و نگار کی، پھر لال قلعہ

www.kitaabistan.com

کی سیر کی، گھوڑ دوڑ کا میدان دیکھا، بعض اور تاریخی مقامات پر پہنچا، لیکن جس یوسفِ گم گشتہ کی تلاش میں یہاں کی خاک چھاننے آیا تھا اُس کا کوئی سراغ نہ ملا، ناچار دہلی سے جالندھر روانہ ہو گیا، وہاں پہنچ کر اپنے رہائشی مکان کے ایک نئے مکین سے ملا، جنہوں نے میرا پُرتپاک خیر مقدم کیا، حضرت امام ناصر الدین علیہ الرحمۃ آفتابِ چشتیہ، کے مزارِ پُرانوار پر حاضری دی، دو دن بہ ضرورت یہاں ٹھہر کر لاہور اور وہاں سے گوجرانوالہ پہنچا، بفضلہٖ تعالیٰ سب اعزہ و اقربا کو بعافیت اور بخیریت تمام پایا، خدائے لم یزل کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا، اور دوسرے ہی دن سے اپنے معمولاتِ زندگی میں مصروف و منہمک تھا، بعد چندے سفر نامہ لکھنے کا خیال پیدا ہوا، ضروری یادداشتیں بیاض میں لکھی ہوئی تھیں لہٰذا یہ چند سطور لکھنے میں کوئی زحمت محسوس نہیں ہوئی، لکھنؤ اور بھوپال کی رنگین ادبی محفلوں کی یاد اب تک تازہ ہے اور تازیست رہے گی، لیکن معلوم نہیں کیوں اور کن تاثرات کے ماتحت یہ شعر اکثر گنگنا لیتا ہوں ؎

ذرا سی خاک پالی تھی دیارِ دوست کی ہم نے
نہ جانے اُس کو بھی بادِ حوادث نے کہاں پھینکا

تمت بالخیر

لاہور
۲۴ دسمبر ۱۹۵۶ء

شادؔ قدوائی

علّامہ محوؔی صدیقی لکھنوی کی دو نظمیں

(۱)

"گلۂ بے نیازی اپنے حبیب سے"

تجھے کیا جو قلبِ ستم زدہ میرا دقفِ حزن و ملال ہے — تجھے کیا جو میں ہوں شکستہ دل تجھے کیا جو میرا یہ حال ہے
تجھے کیا جو تیرے فراق میں مجھے اپنی زیست وبال ہے
کہ میں خود ہوں پیکرِ دردِ غم

تجھے کیا جو کلفتِ روز و شب سے کوئی غریق محن رہے — تجھے کیا جو شدتِ سوزِ غم سے ہمیشہ دل میں جلن رہے
تجھے کیا جو کثرتِ داغہائے دروں سے سینہ چمن رہے
کہ میں خود ہوں خوگرِ ہر الم

نہ ہو تو حزیں میرے نالے میں جو یہ میرا حال تباہ ہے — نہیں تجھ سے کوئی گلہ نہیں جو بھری ہوئی نہ نگاہ ہے
نہ اثر پذیر ہو تو کہیں جو یہ لب پہ نالہ و آہ ہے
کہ میں خود ہوں موردِ صد ستم

تجھے فکر کیوں ہے جو اسطرح شب و روز کوئی ملول ہے — مرا چارہ ساز ہے وہ خدا تجھے فکر میری فضول ہے
جو ستم ہو جانِ عزیز پر مجھے سب خوشی سے قبول ہے
نہ ہو تیری مشقِ جفا یہ کم

تجھے کیا جو دستِ زمانہ سے کوئی دقفِ صدمۂ یاس ہو — تیرا دل ہو کس لئے مضطرب تجھے کیوں یہ خوف ہراس ہو
مرے حالِ زار کو دیکھ کر مری جان تو نہ اُداس ہو
کہ نصیب کے ہیں یہ سب کرم

یہی وہ حسین ہیں بیڑیاں جو میرے لئے ہیں بلائے جان — نہ چھٹے گا ان سے اسیر دل کہ یہ ہیں سلاسلِ جانفشاں

مجھے ان سے ملتی ہے کب اماں مجھے چھوڑتے ہیں بھلا کہاں
ترے گیسوؤں کے یہ پیچ و خم

جو کھلا رہی ہیں یہ کاہشیں تو کھلانے دے انہیں شوق سے　　جو ستا رہی ہیں یہ گردشیں تو ستانے دے انہیں شوق سے
جو ستا رہی ہیں یہ کاوشیں تو ستانے دے انہیں شوق سے
کہ نہیں ہیں در خورِ طیش ہم

یہ جو پھر رہا ہوں میں دربدر یہ جو دور ہوں میں چارسو　　تجھے کچھ خبر بھی ہے یا نہیں کہ ہے صرف تیری ہی جستجو
مرے سینہ میں ہے جو اک چبھن وہ ہے صرف تیری ہی آرزو
نہ مٹے گی دل سے یہ اے صنم

پسِ مرگ خاک میں مل کے بھی دمِ عشق تیرا بھرونگا میں　　یہیں اب بنے گی مری لحد ترے کوچہ ہی میں مرونگا میں
یہیں جان دینا ہے اب مجھے یہیں اپنا خون کرونگا میں
نہ اٹھے گا در سے ترے قدم

نہ ہوائے عشرتِ بزم ہے نہ اب آرزوئے سرودہے　　مجھے پاسِ عشقِ حبیب ہے مجھے بس عزیز ہے ایک شے
کہ نہ آئے دامنِ صبر پر کوئی داغ یوں ہو یہ راہ طے
کہ مری وفا کا رہے بھرم

تجھے کیا پڑی ہے جو آکے تو کسی غم نصیب کی لے خبر　　تجھے کیا جو محوِ زار کو نہیں کاہشوں سے کبھی مفر
نہ کر اعتنا کبھی تو ادھر نہ ہو شفقت مرے حال پر
مجھے اپنے حسن کی ہے قسم

غزل

(۲)

مری دیوانگی جاکر اسیروں میں پکار آئی　　قفس کو توڑ ڈالو تم تو ہم سمجھیں بہار آئی
بدیں کاوش نظر آتے نہیں دام و قفس انکو　　نشیمن ہی پر آئی اور بجلی بار بار آئی
ابھی رگ رگ سے خونِ گرم کے جاری ہیں فوارے　　قفس میں دل اگر سن لے گلستاں میں بہار آئی
امارت کی نہیں پروا مگر یہ کیا قیامت ہے　　غریبوں کو محبت بھی نہ یارب سازگار آئی
مصور کی نظر شاعر کا دل دونوں ہیں سجدے میں　　جوانی بن کے قدرت کا انوکھا شاہکار آئی
نہیں کہتا کوئی ہاں پوچھتا پھرتا ہوں محشر میں　　بتا دو تو محبت بھی کسی کو سازگار آئی
ہمیں روکا مگر اس کو نہ روکا ناصحو تم نے　　کسی کی یاد آئی اور ظالم بار بار آئی
وہ آئے پھول کچھ آنکھوں نے کچھ دامن پہ برسائے　　یہ تو تربت میں ہم ہیں اور تربت پر بہار آئی
خطا دل کی نہ آنکھوں کی نظر آئے جو وہ محوی　　نگاہوں میں مری رگ رگ سے کھنچ کر جانِ زار آئی

مولینا سرشار کسمنڈوی لکھنوی کی دو نظمیں

(۱)

"عازمینِ دیارِ حبیب سے"

ارادہ کرنے والو بیتِ اطہر کی زیارت کا　　مبارک تم کو اذنِ حاضری ختمِ رسالت کا
خوشا قسمت کہ تم دیکھو گے جا کر اپنی آنکھوں سے　　وہ روضہ معترف ہے عرشِ اعظم جسکی رفعت کا
زہے تقدیر وہ دلکش مناظر سامنے ہوں گے　　شگفتہ جن سے ہوگا ہر تصور باغِ جنت کا
خوشا قسمت کہ ان ذروں کو آنکھوں سے لگاؤ گے　　یقیں ہوتا ہے جن ذروں پہ خورشیدِ قیامت کا

www.kitaabistan.com

خوشا وقتیکہ تم باتیں کرو گے دُو بدو اس سے
لیا ہے جس نے ذمہ اپنی امت کی شفاعت کا
جب اپنا دردِ دل تم کہہ چکو سرکارِ بطحاؐ سے
سلامِ شوق کہہ دینا مری مجبور قسمت کا
مری جانب سے پھر ان آنسوؤں کو پیش کر دینا
یہ بن سکتے ہیں نذرانہ مرے جوشِ عقیدت کا
یہ کہہ دینا کہ بے مایہ تو ہے بے حس نہیں لیکن
بہت بے چین رکھتا ہے اُسے جذبہ محبت کا
یہ کہہ دینا کہ اُس کا درد ہے اب رحم کے قابل
بڑی نازک حدوں میں قافلہ ہے یاس و حسرت کا
یہ کہہ دینا کہ اُس کا لکھنؤ میں دل نہیں لگتا
مگر اسلوب بن پڑتا نہیں قطعِ مسافت کا
یہ کہہ دینا کہ اُس کی زندگی میں کَس نہیں باقی
ضرورتمند ہے سرکارؐ کی چشمِ عنایت کا
یہ کہہ دینا کہ بد اعمالیوں پر اپنی نادم ہے
گھلائے ڈالتا ہے اُس کو اندیشہ قیامت کا
یہ کہہ دینا سکونِ قلب کی اُس کو ضرورت ہے
کوئی عنوان بنتا ہی نہیں تسکین و راحت کا
یہ کہہ دینا کہ اُس کو پوچھنے والا نہیں کوئی
اسے بھی آسرا ہے آپ ہی کے حسنِ رحمت کا
یہ کہہ دینا کہ وہ بھی منتظر ہے ایک مدت سے
اُسے بھی حق پہنچتا ہے مدینہ کی زیارت کا
یہ کہہ دینا بصد آداب اُس کی التجا یہ ہے
بنالیں آپ شاعر اُس کو دربارِ رسالتؐ کا
یہ کہہ دینا کہ انوارِ رسالتؐ کی تجلّی میں
شرف حاصل ہے اُس کو نعتِ بیضا کی خدمت کا
یہ کہہ دینا کہ آزادی کی راہیں بند ہیں اُس پر
بہت مایوس کُن ہے فیصلہ اربابِ سطوت کا

یہ کہہ دینا مخاطب کر کے محبوبِ دو عالم سے
بدل دیں آپ رُخ سرشار کی بے مایہ قسمت کا

غزل

(۲)

شبابِ غنچہ و گل برقرار ہے ہم سے
خفا سی پھر بھی عروسِ بہار ہے ہم سے
یہ دیکھ کر کہ جہاں خلد زار ہے ہم سے
کھنچا کھنچا سا غمِ روزگار ہے ہم سے
فروغِ حسن کی جلوہ طرازیوں کی قسم
طلوعِ صبحِ شبِ انتظار ہے ہم سے
ہمیں کو رنگِ چمن دیکھنے کا علم نہیں
اگرچہ رنگِ چمن استوار ہے ہم سے
یونہی نہیں ہے نشیمن پہ باغباں کی نظر
چمن میں گرمیٔ برق و شرار ہے ہم سے
ہمیں کو اپنی نمائش ابھی پسند نہیں
ازل سے ورنہ تجلّی کو پیار ہے ہم سے
یہ بات اور ہے خود ہی اُدھر کا رُخ نہ کریں
بہت قریب کسی کا دیار ہے ہم سے
اُچھل اُچھل کے مکدر نہ کر فضائے دل
سنبھل سنبھل کہ نظر ہم کنار ہے ہم سے
گذر گئے تھے کسی دن سمیٹ کر دامن
گلہ گذار ہر اک نوکِ خار ہے ہم سے
ذرا قریب سے دیکھو تو راز کھل جائے
وہ دُور رہ کے بھی کیوں ہوشیار ہے ہم سے

فضا خراب ہو کتنی ہی پھر بھی اے سرشار
یہ میکدہ ہے یہاں کی بہار ہے ہم سے

شادؔ قدوائی کی دو نظمیں

(۱)

خمسہ بر اشعارِ حضرتِ شوقؔ قدوائی علیہ الرحمتہ

کہاں ہیں کیفیاتِ الفت یہ میں جانوں یا مری قسمت
رہِ حسرت باعثِ حسرت یہ میں جانوں یا مری قسمت

اُن کی جفائیں اُن کی کدورت یا میں جانوں یا میری قسمت
تیری وفائیں اور محبت یا میں جانوں یا میری قسمت

اُن کی ادائیں اُن کی طبیعت یا میں جانوں یا میری قسمت

فتنہ بپا ہر گام پہ کرنا ناز سے یوں اٹھلا کر چلنا
وہ اُن کا گلشن میں جانا غنچوں کو چٹکی سے مسلنا

فرطِ خوشی یا شدتِ غم سے اشک مری آنکھوں سے نکلنا
سیر کو باغ میں آنا جانا دیکھ کے مورت دل کا مچلنا

اُن کو پا لینے کی حسرت یا میں جانوں یا میری قسمت

چُپ ہی بھلی ہے کیا میں سناؤں دکھ سے بھرا ہے میرا فسانہ
سوختہ ساماں اور خوشی سے دنیا کی ہوں میں بیگانہ

یاس کی صورت ہر دم وحشت کہتے ہیں مجھ کو سب دیوانہ
شہر سے دُور کہیں ویرانہ اُس میں فقط میرا کاشانہ

شب کا اندھیرا درد کی شدت یا میں جانوں یا میری قسمت

اُن کے جنونِ شوق میں میں بے چین نہ دن اور رات میں پایا
اُف رے تصور اُن کے پائے ناز پہ سر رکھ دینا میرا

اُن کے غم میں حال ہے جو کچھ ایسا کسی کا حال نہ ہوگا
اُن کا تجسس صحراؤں میں ریت کی گرمی کانٹے چبھنا

چھالوں والے پاؤں کی حالت یا میں جانوں یا میری قسمت

اُن کا وفائے عشق سے میرا دل بیزار نہ ہونے دینا
جھوٹی تسلی دیتے رہنا شکوہ گزار نہ ہونے دینا

خود کو میرا سچا مونس اور غمخوار نہ ہونے دینا
ہونٹ چبا کر باتیں کرنا آنکھیں چار نہ ہونے دینا

منہ کی محبت دل کی کدورت یا میں جانوں یا میری قسمت

دیکھ کے منظر ہوشربا یہ بھرتا ہوں ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں
لب پہ تبسم ہلکا ہلکا دل کو لبھا لینے کی راہیں

انگلیاں اُجلی پتلی پتلی نازک ہاتھ اور دلکش باہیں
دوش پہ بکھری بکھری زلفیں گوری رنگت مست نگاہیں

دل میں اُترنے والی صورت یا میں جانوں یا میری قسمت

آنکھیں گردہ قاتل نظریں ہو مدہوش زمانہ اک دم
عجز سے جھک جائیں سر سب کے حسن کا جب لہرائے پرچم

سو فتنوں کو جگانے والا آنکھوں کی مستی کا عالم
ایک قدم میں کرنے والا نظمِ جہاں کو درہم برہم

اُن کا خرامِ ناز قیامت یا میں جانوں یا میری قسمت

اُس کی طلب میں ذوقِ وفا نے سوزِ غمِ فرقت سکھلایا
دہر کی ہر محفل میں ڈھونڈا لیکن سراغ نہ اُس کا پایا

اُس کی یاد نے برسوں مجھ کو ساری ساری رات رُلایا
اُس کی تپش نے سینہ پھونکا دل کو لالہ زار بنایا

اُف میرے سوزِ جگر کی حدت یا میں جانوں یا میری قسمت

جوشِ جنونِ عشق میں جو بھی سر پہ پڑے آفت وہ سہنا
فرطِ وفا سے بس چُپ رہنا کچھ بھی نہ اپنے منہ سے کہنا

دل پہ پیہم رنج گزرنا آنکھوں سے اشکوں کا بہنا
اُن کا تصور اُن سے باتیں جلنا اور تڑپتے رہنا

میرے مضطر دل کی حقیقت یا میں جانوں یا میری قسمت

راہِ وفا میں گم ہو کر بیگانۂ بیم و رجا ہو جاؤں
ہو کے شناسا راہِ الفت میں واقفِ رازِ بقا ہو جاؤں

کشتۂ تیغِ جفا ہو جاؤں اور مثالِ وفا ہو جاؤں
چوم لوں اُن کے نقشِ قدم کو خاک میں مل کے فنا ہو جاؤں

ہے یہی میرا رازِ مسرت یا میں جانوں یا میری قسمت

پھونک دیا سینہ برقِ الم نے سوزِ نہاں نے جلا کر چھوڑا
یہ بھی خبر ہے عشق کی دُھن نے آخر تجھ کو کیا کر چھوڑا

شاد جہاں سے کیوں نہ میں اٹھا اُس نے مجھے رسوا کر چھوڑا
بھول کے بزم میں جا بیٹھا تھا ظالم نے اٹھوا کر چھوڑا

"شوقؔ مری تقدیر کی شامت یا میں جانوں یا میری قسمت"

غزل

(۲)

دل دے کے خریدے یہ بلا اپنے لئے کون
ہر روز محبت میں مرے کون جئے کون

گھُل گھُل کے مرے ہجر میں گھٹ گھٹ کے جئے کون
یادِ لبِ رنگیں میں لہو اپنا پئے کون

رُکتا ہی گھڑی بھر کو نہیں ناخنِ وحشت
پھر زخم کلیجے کا سیئے بھی تو سیئے کون

داغِ غمِ حرماں سے منور ہیں یہ ورنہ — تربت پہ غریبوں کی جلاتا ہے دیے کون
کیوں کر میں کروں وعدۂ فردا پہ بھروسہ — کل تک تو خدا جانے مرے کون جئے کون
مطلوب نہیں ساغرِ صہبا مجھے ایسا — جب فیض ترا عام ہے ساقی تو پیے کون

جب میرے مقدر میں نہیں صبحِ تمنا
پھر حسرتِ موہوم میں اے شاد جئے کون

غزل

(۳)

رہِ الفت میں مٹ کر میں غبارِ راہ بن جاؤں — نگاہِ اہلِ دل میں کوئی حسرت گاہ بن جاؤں
مجھے تقسیم یوں اے جوہرِ سوزِ نہاں کر دے — کسی کا درد بن جاؤں کسی کی آہ بن جاؤں
حریمِ ناز سے ٹکرائیں ذرّے دل کے جا جا کر — اگر میں خوبیٔ قسمت سے گردِ راہ بن جاؤں
ملک سجدہ کریں دل کو جو دل میں آپ آ بیٹھیں — زمیں کیا اہلِ گردوں کی زیارت گاہ بن جاؤں
یہاں کا خاک ہونا اصل میں اکسیر ہونا ہے — میسر کوئے جاناں ہو تو فرشِ راہ بن جاؤں
یہ دل کہتا ہے سچ کہتا ہے پھر تو مرقعِ اعظم ہوں؟ — کسی خلوت نشیں کی گرمیٔ جلوت گاہ بن جاؤں

کلامِ شادِ خستہ کو یہی مدت سے حسرت ہے
وہ ہو تاثیر پیدا واہ سے؟ میں آہ بن جاؤں

تمت بالخیر

اگر آپ جدید معاشرے میں اردو علم و ادب کو تقاضائے وقت سے مربوط اور صنفِ سخن کو نئے تصورات سے مزین شدہ ارتقائے شعر و سخن کے منازل دیکھنا چاہتے ہیں تو ادیبِ شہیر نقادِ فن و کہنہ مشق سخنور جناب شاد قدوائی تلمیذِ رشید حضرت علامہ محوی لکھنوی مدظلہ کا منتخب مجموعۂ اشعار بنام

فرازِ طور

کا شوق سے مطالعہ فرمائیے۔ جو عنقریب زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو رہا ہے۔ ۲۲×۱۶/۲۰ سائز ضخامت ۲ صد صفحات تقریباً دو ہزار اشعار جو اہلِ ذوق اور تشنہ کامانِ نقد زبان و ادب کیلئے دل و دیدہ زیب قابلِ قدر تصنیف ہوگی جس میں جناب شاد قدوائی کے کلام پر مشاہیر شعرائے پاک و ہند کی رائے اور تصاویر بھی شامل ہوں گی قیمت اندازاً سوا تین روپیہ ہوگی پیشگی آرڈر بک کرانے والوں کو خاص رعایت دی جائیگی۔

چنانچہ جناب شاد قدوائی کے کلام پر علامہ محوی لکھنوی حضرت سرشار کسمنڈوی (لکھنوی) جناب احسان دانش جناب سید محمود مخدوم لاہوری وغیرہ حضرات کے علاوہ ملک کے مایۂ ناز شاعر و ادیب صحافی جناب مولانا عبدالمجید سالک صاحب مندرجہ ذیل الفاظ میں اظہارِ رائے فرماتے ہیں:-

خراجِ تحسین و عقیدت

جناب شاد قدوائی اس عہد کے باقیات میں سے ہیں جس میں شعراء اکثر شعر سے پہلے زبان اور فن کے غوامض پر عبور حاصل کرنا اور اس مقصد کیلئے کسی کامل الفن کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ زبان و فن کے معاملے میں ان لغزشوں سے محفوظ رہتے تھے۔ جو آجکل کے بعض شعراء کے کلام کی خصوصیت ہے، اور لطف یہ ہے کہ وہ اس سے باخبر ہی نہیں بلکہ اس پر ناز کرتے ہیں۔ شاد پرانے استادانہ انداز کی غزل کے ماہر ہیں۔ اُن کے کلام میں کہنہ مشقی اور روانی ہے پستیٔ فکر اور ابتذال کا کہیں نام و نشان نہیں۔ یہ فیض حضرت علامہ محوی لکھنوی کا ہے جو اپنے کلام میں بھی ان محاسن کا اہتمام فرماتے رہے اور اپنے تلامذہ کو بھی شعر کی متانت اور سنجیدگی کی

رف متوجہ کرتے رہے۔ غزل کے علاوہ قومی اور فطرتی منظومات میں بھی شاد کی طبع وقاد عاجز نہیں۔
چنانچہ اس مجموعے میں ایسی نظمیں بھی موجود ہیں جو زمانہ حاضر کے واقعات وجذبات سے بھرپور ہیں۔
شاد کو جدید شاعری سے نفرت ہے جسکا اظہار جابجا اُنکے کلام میں پایا جاتا ہے لیکن میرے
نزدیک ہر نئی چیز سے بدکنا بھی درست نہیں۔ ادب وشعر کے نئے اسالیب میں عیوب ونقائص کیساتھ
ساتھ بعض خوبیاں بھی ہیں۔ جنکا ہر حال میں اعتراف کرنا چاہیئے۔ انسان کی مادی اور فکری فعالیتوں
میں تجربے کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور مختلف قسم کے تجربے بہرحال فکری رفتار میں ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔
مجھے یقین ہے کہ فرازِ طور کی غزلیں اور نظمیں سلیم الذوق حضرات سے خراجِ تحسین حاصل کرینگی
اور حضرت شاد نے لکھنؤ اور بھوپال کے سفر اور اپنے استاد اور استاد بھائیوں سے ملاقات کا جو حال
قلمبند فرمایا ہے وہ بھی اپنے خلوص اور سادگی کیوجہ سے بے حد دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔
میں حضرت شاد کی شاعرانہ صلاحیتوں کا پرانا مداح ہوں اس لیئے یہ چند سطور
لکھ کر اُن کی خدمت میں قدر وعزت کا ارمغانِ مختصر پیش کرتا ہوں +

عبدالمجید سالک

مسلم ٹاؤن، لاہور
۱۷ / اگست ۱۹۵۶ء

Library ... Education ... Mall, Lahore.

ملنے کا پتہ

شفقت حسین اظہر حسین قدوائی نمبر ۳ کالج روڈ
گوجرانوالہ

... شاد قدوائی پرنٹر و پبلشر ... نمبر ۳ کالج روڈ - گوجرانوالہ